سوانح حیات
پروانۂ شمع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم
غازی مرید حسین شہید رحمۃ اللہ علیہ
مصنف
رئیس التحریر رائے محمد کمال
شہیدان ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پبلیکیشنز

سوانح حیات

شمع پروانۂ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

غازی مُرید حُسین شہید رحمۃ اللہ علیہ

○

مصنّف

رائے مُحمّد کمال

شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پبلی کیشنز

چاہ میران ۔ لاھور

☆ کتاب غازی مرید حسین شہید علیہ الرحمۃ

☆ مصنف رائے محمد کمال

☆ طباعت اول / اکتوبر ۱۹۹۹ء

☆ تعداد ایک ہزار

☆ کمپوزنگ المصطفیٰ کمپوزنگ سنٹر۔ انار کلی۔ لاہور

☆ ہدیہ

☆ ناشر شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پبلی کیشنز
چاہ میراں۔ لاہور

ملنے کا پتہ

شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پبلی کیشنز

مکان نمبر ۱۵۔ گلی نمبر ۵۱۔ محبوب روڈ چاہ میراں۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

والدہ مرحومہ کی زندہ دعاؤں کے نام

سرگزشت

غازی مرید حسین شہیدؒ، عشقِ رسول کا ایک عظیم حوالہ ہیں۔ مجھے پہلی بار ان کی جانبازی و سرفرازی کا اپنے بزرگ دوست، ملک عبدالکریم صاحب (پنڈی بھٹیاں) سے معلوم ہوا تھا۔ انہوں نے شہیدِ عشقِ رسول کے کارنامہ سے آگاہ کیا تو شدتِ عشق کے سبب ۲۹ دسمبر ۱۹۸۵ء کو "چکوال" کا سفر نصیب ہوا۔ چودھری خیر مہدی صاحب، غازی مرید حسین شہیدؒ کے قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ ان کے سوز و ساز نے دل کو اور بھی گداز کر دیا۔ ان کی پیشانی پر نشاطِ روح کا پورا دیباچہ رقم تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ بندہ، شمعِ رسالت کے بعض پروانوں کی سوانح نگاری کا شرف حاصل کر چکا ہے تو فرمایا:

"جوانی کی رت میں آپ نے ایک نیک جذبے کے تحت طویل سفر اختیار کیا۔ اس سلسلے میں ہر لحاظ سے تعاون آپ کا حق اور ہمارا فرض ہے"۔

چودھری صاحب کی نگاہیں چند ثانیے دور خلا میں یادوں کے چراغ جلاتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے حافظے کی قبر کریدنے لگے۔ بلاشبہ، ان کے دل و دماغ میں روحانی معلومات اور کیف و مستی کی ایک دنیا آباد ہے، بے مثال دنیا۔ چودھری صاحب سے میری یہ ملاقات پورے چوبیس گھنٹوں پر محیط تھی۔ جو ذرا ذرا وقفہ کے ساتھ متواتر جاری رہی۔

چودھری خیر مہدی صاحب کے ایک لختِ جگر، دُر ریز خان فی الواقع خلوص و وفا کا مجسمہ ہیں اور ہمدردی و مہربانی کا پیکر۔ خدا حافظ کہنے دور تک میرے ساتھ آئے تھے۔ یادوں کی خوشبو سے دامنِ دل اب بھی مہک جاتا ہے۔

برِصغیر پاک و ہند میں مسلم کُشی کا باقاعدہ آغاز ایک متعصب اور کج خیال ہندو سوامی دیانند سرسوتی کی ناپاک کتاب "سیتارتھ پرکاش" سے ہوا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو شاید ایک مسلم ملک کے طور پر "پاکستان" کبھی معرضِ وجود میں نہ آتا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ہی ہندو احیاء کی تحریکیں سر اٹھا چکی تھیں۔ "آریہ سماج" ایک ایسی ہی منظم اور فتنہ پرور سازش تھی۔ اس کے ساتھ ہی پورے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کے دروازے کھل گئے۔ اس کی ایک جھلک ہمیں ۸ مارچ ۱۹۳ء کو روزنامہ "آریہ مسافر" میں لکھے گئے اداریے میں دکھائی دیتی ہے۔ اس میں یہ عبارت بطورِ خاص طبع ہوئی تھی:

"ملکی اور مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کو ویدک دھرم اور ویدک تہذیب کے نزدیک لانا ازحد ضروری ہے۔ جب تک مسلمان، سرزمینِ حجاز کے عاشق ہیں، عرب کی سرزمین اور کھجوروں پر جان نثار کرتے ہیں، اور زمزم کو گنگا پر ترجیح دیتے ہیں، وہ ہندوستان سے محبت نہیں کرسکتے۔ اس لئے ملک میں ایک قوم پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم ویدک دھرم کا پیغام جلد از جلد ان تک پہنچائیں"۔

اسی جذباتی فضا میں روزنامہ پرتاپ نے لکھا تھا کہ اس ملک میں حکومت عددی اکثریت پر موقوف ہے، اس لئے شدھی کی تحریک ہندوؤں کے لئے موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ مسلمان ایک حقیر اقلیت سے سات کروڑ کی تعداد تک پہنچ چکے ہیں۔ عیسائی چالیس لاکھ ہیں اور ملک کے بائیس کروڑ ہندو ان کی وجہ سے بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر ان کی تعداد یونہی بڑھتی رہی تو نہ جانے کیا حشر ہوگا۔ شدھی کی تحریک بنیادی طور پر مذہبی تحریک ہے۔ مگر اس کے دوسرے

مضمرات نے تمام ہندوؤں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے مذہب میں قبول کر لیں۔

ہندو اخبار "ینگ انڈیا" میں اسی طرز کا ایک اور زہریلا آرٹیکل شائع ہوا۔ جس میں ہندوؤں کو بتایا اور سمجھایا گیا کہ مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا وہ لوگ جو ہم میں سے تھے اور اب ہم سے الگ ہو چکے ہیں۔ اگر ہمیں اپنا وقار قائم رکھنا ہے تو ہمیں صرف تین طریقے اختیار کرنا پڑیں گے۔

ا۔ مسلمانوں کو اسلام سے الگ کر کے ان کے پرانے دھرم پر واپس لایا جائے۔

۲۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان لوگوں کو ہندوستان میں رعایا بنا کر رکھا جائے۔

۳۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو ان کے اپنے قدیم علاقے میں واپس بھیج دیا جائے۔

اس حوالے سے ہندوؤں کی دو تحریکیں بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ اولاً شدھی۔ ثانیاً سنگھٹن۔ شدھی سے مراد ہے، پاک کرنا۔ مراد یہ تھی کہ لوگ، دینِ اسلام قبول کر کے ناپاک ہو گئے ہیں، ان کو دوبارہ ہندومت میں لا کر پاک کیا جانا چاہئے۔ سنگھٹن کی غرض وغایت یہ تھی کہ اگر مسلمان ترغیب و تحریص سے ترکِ اسلام پر تیار نہ ہوں تو پھر انہیں بزورِ طاقت، ہندو بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینا ہر ہندو کا مذہبی فرض ہے۔

تاریخی حقائق سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ شدھی و سنگھٹن تحریکوں کے پسِ منظر میں انگریز ذہنیت کار فرما تھی۔ ہندو اور انگریز نے مل کر مسلمانانِ ہند کو من حیث القوم مٹانے یا ٹھکانے لگانے کا پیچ در پیچ منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ ان کی سب سے خطرناک کڑی تحریکِ شاتمِ رسول تھی۔ محبوبِ خدا ﷺ کی ذاتِ

بابرکات سے لامحدود محبت اور غیر مشروط وفاداری ہی ایمان کی جان اور مسلمان کی پہچان ہے۔ رازِ بقا بھی یہی ہے۔ ایک مؤمن کے سینے میں روحِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی تو ہے جو اسے موت کے منہ میں بھی مسکرانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ سازش یہ تھی کہ فرزندانِ اسلام کے قلوب واذہان سے عشقِ رسولِ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نچوڑ لیا جائے۔ ایسی ہی ایک ناپاک جسارت کے موقع پر غازی مرید حسین شہیدؒ نے بدزبان وٹرنری ڈاکٹر، رام گوپال کو جہنم رسید کیا تھا اور خود ثبوتِ وفا کے طور پر بزمِ دار و رسن سجائی۔ آپ کی داستانِ محبت بڑی بے مثال اور لازوال ہے۔

۸ / اگست ۱۹۸۶ء کے روز حسن و عشق کا یہ ایمان پرور واقعہ، ترتیب و تشکیل کے مرحلہ سے گزر کر پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ "شہیدانِ ناموسِ رسالت سیریز" کے تحت صاحبزادہ حاجی محمد حفیظ البرکات شاہ (ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور) اسے چھاپنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ قبل ازیں اس سلسلے میں غازی علم الدین شہید اور غازی میاں محمد شہید کے حالات وواقعات زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے تھے۔ ازاں بعد غازی محمد صدیق شہیدؒ کا تذکرہ بھی منظرِ عام پر آیا۔ حاجی محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب کی فرمائش پر راجا رشید محمود صاحب نے ان کے لئے ایک جامع مقدمہ بھی سپردِ قلم کیا۔ بناء بریں مسودے کی کتابت بھی ہو چکی۔ نہ جانے پھر کیا حالات پیش آئے کہ ضیاء القرآن کی طرف سے آج تک اسے کتابی شکل میں سامنے نہیں لایا جاسکا۔ اپنے مسائل ووسائل کی وجہ سے شدید ترین خواہش کے باوجود بھی میں ذاتی طور پر طباعت واشاعت کو ممکن نہ بنا سکا۔ لہٰذا کتابت شدہ مسودہ تاحال صاحبزادہ حاجی محمد حفیظ البرکات شاہ (ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور) کی دسترس میں ہے۔ تاہم اس کی اشاعت کا شرف "شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پبلی کیشنز" کو حاصل ہو رہا ہے۔ بناء بریں یہ لوگ دیگر شہیدانِ

ناموسِ رسالت کے تذکار و سوانح بھی چھاپنے میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یقیناً بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے انہیں اس کارِ خیر کا اجر عطا ہو گا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کے وسیلہ جمیلہ سے انہیں دینی و قومی خدمت کی مزید توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

رائے محمد کمال

(حافظ آباد)

۲۷ ستمبر ۱۹۹۹

کسبِ کمال

غازی مرید حسین شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات سے متعلق ایک ایمان افروز رسالہ پیشِ خدمت ہے۔ رائے محمد کمال کے قلم اور ایمان کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی کوئی تحریر زیرِ مطالعہ آتے ہی قارئین پر خود بخود اثرات مترتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکار و سوانح کی تشکیل و تکمیل ان کے ذوقِ تخلیق کا حقیقی شاہکار ہے۔ اس باب میں ایک ایک لفظ زندہ و تابندہ ہے۔ ان کا طرزِ نگارش منفرد ہے اور اثر آفرین بھی۔ بالیقین نگارشات کا یہ قابلِ قدر و قابلِ فخر نمونہ، ملتِ اسلامیہ کے پاک باز شاہینوں کو ایک نیا جذبہ اور ولولہ بخشے گا۔

شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پبلیکیشنز کے پلیٹ فارم سے ہماری مخلصانہ کاوش ہے کہ شمعِ رسالت کے پروانوں کے ذوق و شوق اور جذبۂ سرفروشی کی باتیں، نوجوانانِ قوم تک ہدیۃً پہنچائی جائیں۔ خداوندِ کریم کے فضل و کرم اور حضور پُر نور شفیعِ یوم النشور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحمت و توجہ سے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آخر میں ہم مصنفِ مذکور، رائے محمد کمال کے ممنون ہیں کہ انہوں نے بطیب خاطر اس گرانقدر نسخے کی اشاعت و طباعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ دعا ہے کہ مولا کریم ہم سب کو دین و دنیا میں بھلائی کی توفیق عطا فرمائے (آمین ثم آمین)۔

گدائے مدینہ!

محمد سہیل رضا قادری

پنجاب کے نقشے پر سرگودھا سے قدرے گریزاں بیضوی لکیروں میں گھرے ہوئے ایک شہر کا نام ''چکوال'' ہے۔ اس کے اردگرد راولپنڈی، جہلم، گجرات اور میانوالی کے اضلاع گھیرا ڈالے دکھائی دیتے ہیں۔ گزشتہ برسوں ہی اس کا یومِ تاسیس منایا گیا تھا۔ یہ شہر راولپنڈی سے تقریباً ایک سو کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ اس کے رقبے پر ایک قطار میں پہاڑوں کا عظیم سلسلہ بھی اپنی میخیں گاڑے کھڑا ہے۔ علاقہ مذکور کی زمین ریتلی ہے اور بعض جگہ پتھریلی۔ زراعت کے میدان میں خاص اہمیت نہ سہی، تاہم اس قطعۂ ارض کے دامن میں سیاحوں کے لئے قدرت نے مختلف النوع دلچسپیوں اور کشش کا وافر سامان پیدا کر رکھا ہے۔ جغرافیائی اہمیت کے علاوہ، تاریخ کے حوالے سے بھی اس کی قدر و قیمت میں کلام نہیں۔ مغربی پہلو میں واقع تلہ گنگ کا تاریخی قصبہ بھی انفرادیت رکھتا ہے۔ جب بھی آزادی کے سفر کی بات چل نکلتی ہے تو یہ قطعات ضرور زیرِ بحث آتے ہیں۔ جہادِ کشمیر کا تذکرہ ہو یا بھارت اور پاکستان کے درمیان لڑی جانے والی کوئی اور جنگ، ان مقامات کے باشندوں کا جذبۂ سرفروشی، شجاعت و جوانمردی اور وطن دوستی کا موضوع لازماً چھڑ جاتا ہے۔ مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ

آزادی سے قبل اس سرزمین پر ایسے جانباز بھی بستے تھے جنھوں نے نہ صرف یہاں بلکہ دیارِ غیر میں بھی اپنا مقام پیدا کیا۔ جان پر کھیل کر تاریخ کو تازہ عنوان بخش گئے۔ انھوں نے نوکِ خنجر سے جبینِ وقت پر یہ ابدی حروف لکھ دیئے کہ آج کے بعد قریہ زوال میں کبھی قحط الرجال کا ماتم نہیں ہوگا۔ زندہ رہے تو زندگی؛ دین کے لئے وقف تھی۔ موت کی آغوش میں پہنچے تو چہروں پہ بشاشت اور ہونٹوں پر تبسّم تھا۔ دار و رسن کو چوما اور تختے پر کھڑے ہو کر قوم کو درسِ وفا دیا۔ شمعِ رسالت ﷺ کا ایک پروانہ، غازی مرید حسین شہید...... یہ قریشی زادہ عبقری، چکوال سے چار پانچ میل کے فاصلے پر چوا سیدن شاہ جانے والی سڑک کے پہلو میں واقع معروف گاؤں "بھلہ شریف" میں پیدا ہوا۔

غازی مرید حسین شہید کے والدِ محترم کا نام: عبداللہ خان ہے۔ چودھری عبداللہ خان مرحوم و مغفور بھلہ کے نمبردار اور باوقار بزرگ تھے۔ گاؤں میں ان کی اچھی خاصی زمین تھی۔ آپ کے کردار میں حُسن تھا اور گفتگو میں سلیقہ۔ ایک روشن ضمیر مردِ مومن سے نسبتِ روحانی کے سبب چودھری صاحب کا دل دردو سوز کی کیفیتوں سے لبریز رہتا۔ آپ کی آنکھ بالعموم نم ہوتی اور زبان، یادِ الٰہی میں مصروف۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو عزت و دولت اور شہرت عطا کر رکھی تھی۔ مگر ان تمام نعمتوں کے باوجود گھر کے در و دیوار پر اداسی چھائی رہتی۔ ماحول میں افسردگی ہوتی۔ ایک خلا سا دکھائی دیتا۔ وجہ ان کی یہ تھی کہ آپ طویل مدت تک اولاد سے محروم رہے۔ بالآخر ہزار دعاؤں اور منتوں کے بعد بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے ۲۴ فروری ۱۹۱۴ء کو فرزندِ ارجمند سے نوازا۔ سید جمیل شاہ صاحب نے ان کا نام "مرید حسین" رکھا۔ یہ بزرگ آپ کے والدِ محترم کے

مرشد اور موضع ڈھڈیاں کے رہنے والے تھے۔ غازی صاحب کی پیدائش عشا کے وقت ہوئی۔ نومولود، ان کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور تھا۔ اُس کو دیکھ کر جیتے تھے۔ بچے کی بڑی محبت اور شفقت سے پرورش کی گئی۔

وہ پھولے نہ سماتے، خاصی سوچ بچار کے بعد مرید حسین، نام تجویز کیا تھا۔ کہتے ہیں، نام سے شخصیت و کردار پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ البتہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بچے کا تعارف، والدین کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ گہرائیوں میں سوچنے والے تو اس سے ان کے اسلامی و غیر اسلامی ذہن کا تجزیہ بھی کر لیتے ہیں۔ نام کے حوالے سے ظاہر ہے کہ آپ کے ماں باپ کو خانوادۂ نبوت سے کس درجہ والہانہ شیفتگی تھی۔ مرید حسین کی قسمت کا صفحہ، جب کارکنانِ قضاء وقدر نے الٹ کر دیکھا تو مسکرا پڑے۔ اس مرید کو آگے چل کر حاصلِ مراد بننا تھا۔ اس سے ایک گھر نہیں بلکہ مستقبل میں ان گنت دل آباد ہونے والے تھے۔

تاریخی لحاظ سے یہ روایت خاص دلچسپی کا موجب ٹھہری کہ ایک قریشی النسل بزرگ کا صدیوں پہلے ہندوستان میں ورود ہوا۔ وہ عزمِ تبلیغ رکھتے تھے۔ اس نیت کے ساتھ انہوں نے خطۂ عرب سے ہجرت کی اور بت پرستوں کے وطن میں تشریف لائے۔ اُن کے ہندوستان کے سفر کا خلاصہ یہ جانا گیا کہ مسجدیں تو تربیت کا کام دیتی ہیں۔ تبلیغ کے لئے ہمیشہ شرک و کفر زار کی بستیاں چنی جانی چاہئیں۔ الغرض مختلف علاقوں کی سیاحت فرماتے ہوئے جب یہ دزدیش سرگودھا کے معروف قصبہ بھلوال و شاہ پور کے نزدیکی گاؤں ''کھوٹ'' پہنچے تو یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ موصوف، غازی مرید حسین شہیدؒ کے جدِ امجد اور حضرت علی المرتضیٰؓ کے شیر دل صاحبزادے حضرت عباسؓ کی اولاد سے

ہیں۔ دوسری روایت کے مطابق ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ کے فرزند، محمد بن حنفیہؒ سے جا ملتا ہے۔ حضرت محمد عون قطب شاہ اسی سلسلے کے ایک بزرگ تھے، جن کی اولاد برِ صغیر پاک و ہند میں "اعوان" کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپ نے خاندانی شرف و وقار، حسنِ کردار اور دیگر ذاتی اوصاف کی بناء پر لوگوں کے دل موہ لئے۔ یہ سوال کہ برِ صغیر میں آپ کے مورثِ اعلیٰ کی گوت "کھوٹ" کیوں کہلائی؟ اور دیہہ "کھوٹ" کا نام پہلے سے موجود تھا یا آپ کی نسبت سے پڑ گیا۔ یہ پہلو راقم کے محدود علم کے مطابق تشنۂ تحقیق ہے۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد عون شاہ کے ایک پوتے "محمد" کا عرف کھوٹ تھا، چنانچہ ان سے جو اولاد ہوئی وہ کھوٹ کہلواتی ہے۔

وجۂ تسمیہ اس کی کچھ بھی ہو، آپ کے صلب سے چلنے والی نسل نے برِ صغیر پاک و ہند میں ہمیشہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ المختصر یہ کہ قریباً پونے دو سو سال پہلے غازی مرید حسین شہید کے قائم مقام مورثِ اعلیٰ "مہر خان" کسی وجہ سے "بھلہ شریف" میں منتقل ہو گئے۔ چلتے چلتے یہ سلسلہ مجاہد ناموسِ رسول تک آ پہنچتا ہے۔

شہید موصوفؒ کی عمر ابھی پانچ برس بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ۱۹۱۹ء کے آغاز میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جب غازی ملت، زندگی کی پانچ بہاریں دیکھ چکے تو آپ کی والدہ محترمہ نے اپنے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے کو قرآنِ حکیم اور دوسری اسلامی کتب کی تحصیل کے لئے سید محمد شاہ صاحب کے ہاں بھیج دیا۔ یہ بزرگ جامع مسجد بھلہ کے خطیب و امام مسجد تھے۔ دوسری طرف عام تعلیم کے حصول کی خاطر اپنے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ جو اس

وقت جانے کیوں "کالا سکول" کہلواتا تھا۔ آپ کے اساتذہ میں غلام محی الدین اور خوشی محمد بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر تو انہی کے ہاں رہتے تھے۔ دس سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم مکمل کر چکنے پر انہیں قریبی قصبہ کریالہ کے اینگلو سنسکرت مڈل سکول میں بٹھا دیا گیا۔ آپ شروع ہی سے بلا کے ذہین اور محنتی تھے۔ مڈل کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول چکوال جو، اب ڈگری کالج بن چکا ہے، میں زیرِ تعلیم رہے۔ نصیر الدین صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ اور نہایت محنتی۔ دیگر اساتذہ میں چودھری فضل کریم۔ مولوی محمد لطیف۔ مولوی محمد دین۔ قاضی غلام احمد۔ قاضی غلام مہدی اور ادیب صاحب کے اسماء گرامی ملتے ہیں۔ میجر شیر محمد آپ کے کلاس فیلو تھے۔

اگرچہ آپ دبلے پتلے تھے لیکن باوجود اس کے کھیلوں میں بھی دلچسپی تھی۔ کبھی کبھار چوگان، ہاکی، کبڈی، کشتی اور والی بال بھی کھیلا کیا۔ عموماً آپ کے ساتھی، کھیل کے دوران بظاہر کمزور جسمانی ساخت کی وجہ سے مذاق کیا کرتے تھے۔ آپ کی عمر پندرہ برس سے چند ماہ اوپر ہو چکی تھی۔ دو سال کی مدت پوری کرنے کے بعد میٹرک کے امتحان منعقدہ ۱۹۳۱ء میں شامل ہوئے۔ ۱۹۳۲ء کے آغاز میں رزلٹ آؤٹ ہوا۔ آپ نے نہ صرف فرسٹ ڈویژن حاصل کی بلکہ جماعت بھر میں اوّل رہے اور ضلع میں بھی نمایاں پوزیشن تھی۔ گو اعلیٰ تعلیم کا شوق اور وسائل رکھتے تھے، لیکن بعض ناگزیر گھریلو اور نمبرداری کی ذمہ داری کے سبب سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا۔

نیک سیرت والدہ کی تربیت اور خاندانی شرافت نے آپ کو اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کا سچا شیدائی بنا دیا۔ طبیعت اس قدر حساس پائی تھی کہ کسی انسان

کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو تڑپ اٹھتے۔ ہندوؤں کی ستم کاریاں اور مسلمانوں کی زبوں حالی، انہیں ہر وقت بے قرار رکھتی۔ لہذا آپ نہایت انہماک اور خاموشی سے خدمتِ خلق میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ مسلمانوں کی مرفہ الحالی ہر وقت ان کے پیشِ نگاہ رہتی۔ چونکہ خوشامد آپ کو پسند نہ تھی، اس لئے انگریز انتظامیہ چڑ گئی۔ غیور مردِ مومن کو غیروں کی ناز برداریاں کب گوارا ہو سکتی تھیں۔ آپ کی مومنانہ فراست اور قوم سے ہمدردی کے سبب ہندو بھی بگڑ بیٹھے۔ مگر قبلہ غازی جوان کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ آپ زمانۂ طالب علمی سے ہی نماز روزے کے پابند تھے۔ جب آپ نہم جماعت میں داخل ہوئے تو پہلے پہل ایک مقامی تعلق دار جو چکوال شفٹ ہو گیا تھا، کے ہاں رہائش رکھی۔ ان کا گھر امام باڑہ کے بالکل قریب تھا۔ ازاں بعد سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں آ گئے۔ ان دنوں ہاسٹل سپرنٹنڈنٹ قاضی غلام مہدی صاحب تھے۔ ان اصحاب سے روایت ہے کہ غازی مرید حسین شہید کو ہم نے کبھی نماز چھوڑتے نہیں دیکھا۔ آپ ہمیشہ باجماعت نماز ادا کرتے اور فارغ اوقات میں اکثر اسلامی کتب کا مطالعہ فرماتے۔ درود و سلام اور قرآن پاک کی تلاوت ان کا معمول تھا۔ اس لئے ہمہ وقت باوضو رہتے۔

نبی پاک ﷺ کے عاشقِ صادق کے ماموں، ماسٹر غلام سرور صاحب اور چودھری خیر مہدی صاحب کا بیان ہے، آپ صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند اور ہمیشہ پاک وصاف رہنے کے عادی تھے۔ نماز باجماعت کی پابندی کی یہ حالت تھی کہ اللہ اکبر کی آواز کان میں پڑتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور خانۂ خدا میں پہنچ جاتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ کھانا کھا رہے ہوتے اور اذان کی آواز سن کر کھانا وہیں چھوڑ دیا اور مسجد پہنچ گئے۔

اسی طرح کا ایک قرار آفریں اور الفت انگیز واقعہ چودھری خیر مہدی صاحب نے راقم کو بوقتِ ملاقات سنایا کہ مقامی برادری کے ایک شخص "اللہ داد" نے شادی کی خوشی میں مجھے اور حضرت غازی صاحب کو کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران عشا کی اذان سنائی دی۔ ادھر مؤذن کے منہ سے اللہ اکبر نکلا ادھر آپ نوالہ برتن میں ہی چھوڑ کر مسجد کو چل پڑے کہ جماعت سے نہ رہ جائیں۔ میزبان نے بڑی ضد کی مگر آپ نہ مانے۔ اس وقت اُن کے مابین ایک خوبصورت اور دلچسپ مکالمہ بھی ہوا۔ اللہ داد صاحب نے کہا کہ یہ ایک طویل اور صبر آزما سفر ہے۔ جس پر آپ چل نکلے ہیں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا لمبے سفر کا تو خاص اہتمام کرنا چاہیئے کہ منزل سے محروم نہ رہ جائیں۔

ابھی تو حسرتِ دیدار ہی ہے

نہ جانے لذتِ دیدار کیا ہو

آپ کی نیک طبیعت ظاہری نمود و نمائش اور چودھراہٹ سے کس قدر متنفر تھی؟ اس کا اندازہ نمبرداری کے جنجال اور غلامی کے جوئے سے گلو خلاصی کروا لینے ہی سے ہو جاتا ہے۔ چودھری خیر مہدی صاحب کا بیان ہے کہ: "ابتدا میں آپ نے نمبرداری کی ذمہ داری کو خود ہی سنبھالے رکھا۔ پھر کچھ مدت کے لئے یہ ذمہ داری بطور معاون ایک رشتے دار غلام محمد ولد مدد خان نے نبھائی۔

چودھری صاحب دھیرے دھیرے اپنی یادوں کو تازہ فرماتے اور بتاتے گئے کہ قبلہ غازی صاحب ہاتھ کے سخی اور دل کے فیاض تھے۔ اُن سے مہمان نواز اور ایثار صفت بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ الغرض اجنبی اور شناسا مہمانوں کے علاوہ ڈیرے میں پولیس بھی آجایا کرتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ آپ کا مزاج بدلتا گیا۔

جب آپ نمبرداری نظام کی خرابیوں سے باخبر ہوئے تو آپ کی طبیعت میں اکتاہٹ پیدا ہوگئی۔ ہم نے محسوس کیا کہ آپ متفکر سے رہنے لگے ہیں۔ اس کیفیت کو زیادہ مدت نہیں گزری کہ دسمبر ۱۹۴۵ء کی ایک رات جانے آپ کو کیا خیال آیا کہ مجھے اور اپنے چچازاد بھائی شاہ ولی کو بلا بھیجا۔ ہمارے جانے پر انہوں نے سرہانے کے نیچے سے دو تین صفحات نکال کر پڑھنے شروع کر دیئے۔ آپ نے نمبرداری کی تاریخ و تحریک بتاتے ہوئے کہا کہ اس بارے میں پہلی تجویز ۱۸۵۶ء میں سال زیرِ غور آئی۔ برطانوی حکومت کے کارندوں نے مقامی آبادی کو مرعوب رکھنے کے لئے ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈے اپنا لینے کا عزم کر رکھا تھا۔ وہ لوگوں کو نہ صرف ورغلانا چاہتے تھے بلکہ بلیک میلنگ کا ایک منظم محکمہ قائم کرنا چاہتے۔ اُن کی خواہش تھی کہ ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی لیکن فکر و خیال کے حوالے سے پورے پورے انگریز ہوں۔ لہذا انہی مقاصد کے پیشِ نظر ۱۸۸۰ء میں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا گیا چودھری خیر محمد صاحب کے بقول یہ بتا چکنے پر آپ نے ہمیں نصیحت فرمائی، بہتر تو یہی ہے کہ آپ لوگ بھی اس جنجال میں نہ پڑھیں۔ اگر باز نہ رہ سکو تو پھر تمہاری مرضی! میں نے تو آج اسے خیرباد کہہ دیا ہے اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہم نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ آپ یہ قدم نہ اٹھائیں۔ مگر اُن کے فیصلے حتمی ہوا کرتے تھے۔ اس کے دوسرے ہی روز انہوں نے کئی صفحوں پر مشتمل اپنا تحریری استعفیٰ متعلقہ افسر ملک قطب خان سے مل کر اربابِ اختیار تک پہنچا دیا۔

سانس لینا ہی نہیں ہے زندگی

زندگی کا مدعا کچھ اور ہے

نمبرداری سے قطعِ تعلق کر لینے کے چند روز بعد، ملک قطب خاں صاحب یہاں تشریف لائے اور حسبِ سابق غازی صاحب کو بلوا بھیجا۔ آپ نے اُن کے پاس جانے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے ایسے معاملات سے الگ ہی رہنے دیجئے۔ تھانے میں آنا جانا اور پولیس والوں سے میل ملاپ رکھنا میری طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔"

اب آپ نے ہندوؤں سے ہر قسم کا مقاطعہ شروع کر دیا۔ مشین پر اُن کا آٹا بھی نہ پینے دیتے۔ ایک دوبار مسلمان عورتوں کے سر سے گندم کی بوریاں بھی گرائیں کہ وہ ناپاکوں کی چکی پر نہ لے جائیں۔ آپ شریف النفس تھے اور باکردار بھی، کون تھا جو آپ کے طرزِ سلوک اور اخلاقِ حمیدہ سے متاثر نہ ہو۔ پس آپ کی تمنائیں رنگ لائیں۔ ہر سعیِ جمیلہ بار آور ثابت ہوئی کہ تمام مسلمان آبادی آپ کی ہمنوا بن کر اپنے رسول ﷺ کے دشمنوں سے نفرت کرنے لگی۔ غازی مرید حسین شہید اس قدر مخلص اور مستقل مزاج ثابت ہوئے کہ ہندوؤں کی بسوں میں سفر کرنا بھی چھوڑ دیا۔ چونکہ اُس وقت تجارت، صنعت اور دیگر معاشی وسائل ہندوؤں کی دسترس میں تھے اور ٹرانسپورٹ پر بھی انہی کا قبضہ تھا، اس لئے جہاں بھی جانا ہوتا آپ کو پیدل جانا پڑتا۔

دو قومی نظریے کے اس عظیم حامی و داعی نے مقامی مسلمانوں کی ایک انجمن بنا کر ہندوؤں کا مکمل طور پر معاشرتی بائیکاٹ کر دیا۔ اپنے سرمائے اور اثر و رسوخ سے غریب مسلمان بھائیوں کی دوکانیں کھلوائیں۔ بیداری کی یہ لہر دیکھ کر غیروں نے آپ کو رام کرنے کی ہر ممکن کوششیں کیں۔ پہلے سرکاری دباؤ کے ذریعے پھر دھمکیوں اور لالچ کے ساتھ۔ مگر آپ نے ڈرنا تھا نہ ڈرے۔ تحریک کو

زور و شور کے ساتھ جاری رکھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ آپ کی ملی محبت وہمدردی کے سبب چالباز دشمنوں کو نہ صرف معاشی بلکہ سیاسی موت بھی نظر آ رہی تھی۔ معاشرتی رعب داب دم توڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے اس امر کا بڑی سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ آپ کے عظیم مشن کو ناکام بنانے کی خاطر ہندوؤں کی پوری فوج میدان میں اتر آئی۔ اُن میں بھائی پرمانند (کریالہ) جیسے بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی شامل تھے۔

معاشی و معاشرتی بائیکاٹ کی تحریک کے آغاز سے نہ صرف مقامی بلکہ علاقہ بھر کے ہندو گھبرا اٹھے۔ اس کی بازگشت دور دور تک سنی گئی۔ ایک دو ہندو جرائد نے اس پہلو کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے مسلمانوں کی تنگ نظری و تنگ دلی کا رونا رو دیا اور اشارتاً و کنایتاً اسے تقسیم ہند کی سازش کا شاخسانہ قرار دیا۔ ہندوؤں کا پروپیگنڈہ منظم تھا۔ وہ ہر جگہ واویلا کرتے رہے۔ ان میں بھائی پرمانند جیسے سیاسی لیڈر بھی شامل تھے۔ ایک دفعہ انہی کی شکایت پر جہلم کے انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر ایف۔ ایم۔ انز اور ایس ڈی ایم سید نثار قطب صاحب نے بھلہ شریف کا دورہ کیا۔ ڈسٹرکٹ کمشنر صاحب نے یہاں کھلی کچہری لگائی اور ہزاروں افراد کے روبرو غازی مرید حسین سے استفسار کیا کہ آپ نے ماحول میں گھٹن اور فضا میں منافرت کیوں پیدا کر رکھی ہے؟

غازی صاحب کو جیسے زخم دل دکھانے کا موقع مل گیا ہو۔ آپ نے اس اعتراض کے جواب میں نہایت متانت و وقار کے ساتھ اپنا موقف بیان کیا۔ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ آپ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مجاہد ملت نے مجمع اور انتظامیہ کے مذکورہ افسران کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”مجھے ہندوؤں سے

کوئی ذاتی عناد نہیں تھی۔ نہ ہم نے ان پر کوئی کسی قسم کی زیادتی کی ہے۔ چونکہ ہمارے عقیدے کے مطابق یہ لوگ مشرک و ناپاک ہیں اس لئے مسلمانوں نے ان سے لین دین ترک کر رکھا ہے اور کئے رکھیں گے۔ اس کے لئے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بناء بریں دینِ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنے رسول ﷺ کے گستاخوں کو دوست بنائیں۔

آریہ سماجیوں نے ہمارے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا؟ دوسری ہندو تحریکوں پارٹیوں اور انجمنوں کی اسلام دشمنی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اپنے ارد گرد متمول ہندوؤں کی چیرہ دستیاں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ایک مدت تک ہم دل ہی دل میں کڑھتے رہے ہیں۔ اب ہماری غیرت مند طبیعت متعصب اور دریدہ دہن ہندو بنیوں سے نفرت کے سوا اور کوئی رشتہ قائم نہیں رکھ سکتی۔ کیا ہم شانِ رسالت ﷺ میں ان کی طرف سے گستاخیوں کی طویل کہانی بھول جائیں؟ ابھی تو وہ زخم بھی تازہ ہیں جو ہمیں دہلی، لاہور اور کراچی میں لگائے گئے۔ سوامی شردھانند، راجپال اور نتھو رام کے چیلوں کو ہم سینوں سے کس طرح لگا سکتے ہیں؟ پالامل (قصور) جیسے کمینہ فطرت لوگوں کی ہرزہ سرائیوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ غازی محمد صدیق شہید کی طرح رسمِ وفا نبھانے کی ہم نے بھی قسم کھا رکھی ہے۔

ایک ایسا نوجوان، جس نے ابھی شباب کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تھا، اس کی جرأت و بیباکی اور دینی جذبے کا یہ انداز دیکھ کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آپ کی تمام گفتگو بغور سن لینے کے بعد انگریز افسر نے مسکراتے ہوئے کہا ”تم لوگوں نے تو ابھی سے ایک چھوٹا سا پاکستان بنا رکھا ہے۔

جن کا خمیر اٹھا ہے اسی خاک سے رشید
اُن کو یہاں کی آب و ہوا کا گلہ ہے کیوں؟

سن و سال کے آئینے میں غازی مرید حسین شہید کا سوانحی خاکہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک خوش قسمت بچہ ۱۹۱۴ء میں چودھری عبداللہ خاں کے گھر بھلہ شریف میں تولد ہو۔ ۱۹۲۰ء میں آپ کے والدِ محترم داغِ مفارقت دے گئے۔ ۱۹۲۱ء کے دوران انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مسجد میں بٹھایا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ نے میٹرک کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء تک نمبرداری کے جھمیلوں میں پڑے رہے۔ آئندہ برس ان کے غور و فکر کے لئے مختص تھا۔

جب آپ زندگی کی بیس بہاریں دیکھ چکے تو ان کی نیک سیرت والدہ صاحبہ کے دل میں خوشیاں منانے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۳۵ء میں بیس سالہ مرید حسین کی شادی محترمہ امیر بانو صاحبہ (متوفیہ ۱۹۴۳ء) ہمشیرہ، چودھری خیر مہدی صاحب، نمبر دار بھلہ شریف سے انجام پائی۔ فضول رسمیں غازی صاحب کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ سادگی سے محبت اور تصنع سے انہیں نفرت تھی۔ اس لئے خلافِ روایت آپ کی رسمِ نکاح خاموشی سے ادا کی گئی۔ پہلی بار اس موقع پر آتش بازی کا مظاہرہ ہوا نہ ڈھول بجایا گیا۔

اس رنگ کو دیکھ کر آپ کی والدہ صاحبہ نے حسرتاً کہا "بیٹے شادی پر میرے ارمان پورے نہیں ہوئے۔ یہ کیسی شادی ہے کہ بارات بھی نہیں چڑھی؟" یہ سن کر آپ نے نہایت عاجزی سے عرض کیا: "ماں! آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ میری بارات کو دیکھ کر تو ایک دنیا دنگ رہ جائے گی۔ جو بھی دیکھے گا

دانتوں میں انگلی دبائے گا۔ لوگ کفِ افسوس مل کر کہیں گے کاش یہ شرف ہمیں نصیب ہوتا"۔

وائے ناکامیٔ زاہد، کہ جبیں پر اُس کی
داغِ سجدہ تو بنا، داغِ محبت نہ بنا

غازی صاحب اکثر نزدیکی شہر، چکوال جاتے رہتے۔ وہیں یہ علامہ عنایت اللہ المشرقی کی مشہور خاکسار تحریک کی عسکریت سے متاثر ہوئے اور خاکسار بن گئے۔ ایک دفعہ راولپنڈی گئے تو خاکساروں کی وردی میں تھے۔ خاکساروں میں تنظیم اور قواعد و ضوابط کی پابندی کے باوجود جذبے کی شدید کمی تھی۔ وہ کوئی منزل متعین کیے بغیر پُر خطر راستوں پر محوِ سفر رہے۔ ظاہر ہے خاکسار بن جانے سے آپ کے عشقِ رسالت ﷺ میں ڈوبی ہوئی روح کو سکون نہ مل سکتا تھا۔ روحانیت کی پیاس آپ کو خواجہ چاچڑ وی، حضرت پیر محمد عبدالعزیز صاحب چشتیؒ المعروف قلندر کریم ؒ کے پاس لے گئی۔ مردِ قلندر کی پہلی ہی نظر نے آپ کو دیوانہ بنا ڈالا۔ شیخِ کامل کے جذب و مستی کا اثر مریدِ صادق کی آنکھوں کے جھروکوں سے گزر کر دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ طائرِ لاہوتی نے تیرِ نظر کا شکار ہو کر قلندرِ کریم کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ جوہری نے موتی تلاش کیا یا دُر نے دُریاب کو ڈھونڈ نکالا۔ ساقی، جام و سبو لے کر اٹھے اور صدا لگائی ارے او دیوانے! کہاں ہے تو؟ کہ بادہ خوار، مے کشوں کے امام کی خاکِ پا چومتا ہوا سرِ بام جا پہنچا۔ بہر حال! اکسیر اور کیمیا گر کا تعلق جڑ گیا۔ گوہر، صاحبِ گوہر کی تلاش قرار پایا۔ سُنا ہے قریشی زادہ

عبقری مرید نہیں بلکہ مراد بن کر میکدہ عزیزؒ میں حاضر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے قدحِ شراب میں ڈھل گیا۔

مجلسِ واعظ تو تادیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

بھلہ شریف کے قریب ایک اور مشہور و معروف قصبہ "کریالہ" واقع ہے۔ غازی مرید حسین شہید کے ننھیال کا تعلق اسی گاؤں سے ہے۔ یہ بستی حضرت شہیدؒ کے مسکن و مولد، بھلہ شریف کی آغوش میں پناہ لئے ہوئی ہے۔ حضرت قلندر کریم کے زمانے میں یہ قصبہ ایک مائی صاحبہ المعروف مائی بھگاں کا تکیہ تھا۔ ان کی بیعت تونسہ شریف تھی۔ قدرت نے انہیں قلندرانہ طاقت ودیعت کی ہوئی تھی۔ اگر وہ کسی کی طرف نگاہِ اٹھا کر دیکھتیں تو ماحول پر مستی چھا جاتی، فضا کیف سے معمور ہوتی اور مرکزِ توجہ بننے والے کے ہاتھ میں کوئی چیز بھی ہوتی تو گر پڑتی۔ انہی مائی صاحبہ کا ایک نوجوان بھانجا جس کا رنگ گندمی مگر سفیدی غالب تھی۔ ہونٹ باریک نہ زیادہ موٹے البتہ اکثر اوقات کھلے رہتے، چہرہ لمبائی میں کم اور چوڑائی میں موزوں تا۔ آنکھیں قدرے چھوٹی معلوم ہوتیں تاہم مژگان کا سایہ یہ کمی چھپا دیتا۔ گردن گوشت سے بھری ہوئی اور پر وقار دکھائی دیتی۔ ناک کی بناوٹ سے گمان گزرتا جیسے کسی مصور کا تخیل چرا لیا گیا ہو۔ ماتھے کی ساخت ایسی تھی کہ پورے جسم کا دیباچہ معلوم ہوتا۔ بظاہر دیکھنے والوں کو ان کی صحت کمزور و ناتوان محسوس ہوتی۔ صاف ستھرا مگر سادہ لباس پہنتے۔ اہلِ نظر کو یہ نوجوان کروڑوں میں منفرد اور خوبصورت دکھائی دیتا۔ جن لوگوں کی آنکھ جسم کے جدول پہ ٹھہری انہوں نے اسے قبول صورت جانا۔ یہی

جواں سال خوش قسمت بعد میں غازی مرید حسین شہیدؒ کے نام سے متعارف ہوا۔

مجھ کو آنکھوں کے دریچوں میں سجا کر رکھو
دورِ ماضی کا کوئی قیمتی ورثہ ہوں میں

مخدوم خاندان پنجاب میں مشہور ترین اور ایک عالی نسب خاندان سے ہے۔ حضرت غوث خواجہ بہاؤالحق ملتانی" بھی اسی معزز قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کی ایک شاخ سے خواجہ برہان الدین ہیں جن کا مزار پُر انوار موضع چنگڑانوالہ ضلع سرگودھا میں اب بھی مرجعِ خلائق ہے۔ یہی صاحبِ کرامت بزرگ حضرت خواجہ عبدالعزیز صاحب چاچڑوی" کے جدِّ امجد ہیں۔ قبلہ قلندر کریم" مخدومی و آقائی شیخِ شیوخِ عالم حضرت خواجہ محمد فضل الدین" کے چھوٹے صاحبزادے اور فطرتاً صوفی تھے۔ بچپن میں ہی آپ سے تحیّر انگیز کرامات نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔ جوں جوں عمر پختہ ہوئی جذب و مستی کا رنگ چڑھتا گیا۔ عشقِ سرمدی کا یہ پیکر ہمہ وقت استغراق و کیفیات میں رہتا۔ سوز و گداز کا یہ عالم تھا کہ اپنے مرشدِ کامل کی بارگاہِ اقدس، سیال شریف میں عرس کے موقع پر ایک بار آپ کیفیتِ وجد سے کنوئیں میں گر پڑے۔ جب آپ کو نکالا گیا تو وجدانی کیفیت میں اور شدت آچکی تھی۔ ایک روایت ہے کسی شخص نے سیال شریف میں حضرت خواجہ شمس الدین محمد" کی خدمت میں نذر گزاری اور عشق کے لئے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: "نذرانہ اٹھالو اور چاچڑ شریف چلے جاؤ۔ عشق ہم نے وہاں بھیج دیا ہے"۔

حضرت غریب نواز، خواجۂ خواجگان محمد شمس الدین" کا زمانہ تھا۔ عرس

مبارک کے موقع پر سیال شریف میں ایک فقیر آ گئے۔ جو پاؤں سے برہنہ، بکھرے ہوئے بال اور لمبا پیرہن زیب تن کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے حضور شمس العارفینؒ کی خدمت میں آ کر وحدت الوجود کے متعلق دریافت کیا۔ اس وقت حضورؒ کی خدمت میں درویشوں کے علاوہ پیر حیدر شاہ صاحب جلالپوریؒ، پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ، پیر محمد عبدالعزیز صاحب چاچڑویؒ اور مولوی صاحب مرولہ شریف بھی حاضر تھے۔ حضرت شمس العارفینؒ نے ابھی اس مجذوب کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ قبلہ قلندر کریمؒ نے برجستہ کہا، جس کا جواب بیٹا دے سکے اس کے متعلق باپ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ وہ فقیر بے ساختہ آہ و بکا کرنے لگے اور دربار سے نکل کر جہاں گوشت کے مٹکے لگائے گئے تھے، اس آگ کی چر میں ننگے پاؤں چلنا شروع کر دیا۔ حضرت غریب نواز شمس العارفینؒ مع احباب باہر تشریف لائے اور یہ منظر دیکھنے لگے۔ اُن کے پیرہن پر خون کے چھینٹے پڑتے اور وہ فقیر بار بار کہتے کہ یہ اُس کا خون ہے جس نے مجھے قتل کیا۔ ذرا دیر بعد وہ فقیر، حضرت شمس العارفینؒ سے مخاطب ہوئے اور حضور قلندر کریمؒ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ یہ بیٹا مجھے دے دو۔ اس پر پیر سیال جلال میں آ گئے اور فرمایا

"آپ کے سید اور مہمان ہونے کی وجہ سے ہم نے آپ کا بہت لحاظ کیا ہے لیکن آپ حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں"۔

آپ کا یہ کہنا تھا کہ وہ آگ سے نکل کر سیال شریف سے چلے گئے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ ان بزرگ کا نام احمد شاہ قندھاریؒ تھا۔ جو گندم یا گندم کی بنی ہوئی کوئی چیز نہ کھاتے۔

یہ قصہ لطیف ابھی نا تمام ہے
جو کچھ بیاں ہوا ہے وہ آغازِ باب تھا

حضرت قلندر کریمؒ نے زندگی کے آخری چھے سال (۱۹۳۲ء۔ ۱۹۳۸ء) میں نان و نفقہ سے بڑی حد تک احتراز کیا۔ آپؒ نے اس دوران گندم یا گندم کی بنی ہوئی کوئی چیز تناول نہ فرمائی۔ حتیٰ کہ آخر دس ایام میں خوراک بالکل کم ہو گئی تھی۔ اور گھٹتے گھٹتے لقمے سے بھی کم رہ گئی۔ اس مدت میں علاج کی خاطر آنے والے ڈاکٹر اور حکیموں کو آپ کی نبض نہیں ملتی تھی۔ اور وہ حیران ہوتے کہ اللہ کا یہ بندہ، زندہ کیسے ہے۔

آپ کا فقر بڑا انوکھا تھا۔ لٹو چلتا دیکھتے تو ہو ہو کی گونجدار آواز میں گم ہو جاتے۔ آپ کو جوگ سے بے حد شغف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وقتِ آخر آپ نے گدڑی پہنی۔ چونکہ آپ منزل کے بجائے سفر پسند کرتے اور سکون کو اضطراب پر ترجیح دیتے، اس لئے جوگیوں کا روپ اور متوکلانہ گشت آپ کو نہایت بھاتا تھا۔ سو بعض اوقات جوگیانہ لباس پہن لیتے۔ نیز چمٹا، کنٹھہ، کھڑاؤں، بیراگن، ناد اور کشکول کو عزیز رکھتے۔

ماضی قریب میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ جب پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کا لاہور میں مرزا قادیانی سے مناظرہ طے پایا۔ قبلہ گولڑویؒ اس میں مسلمانوں کے تمام مکاتیبِ فکر کی نمائندگی فرما رہے تھے۔ پھر مقابلے کی بات چلی جس پر آپ نے مزید خوشی کا اظہار کیا۔ حضرت قلندر کریمؒ اس تقریب میں اپنے ہم مشربوں کے ہمراہ موجود رہے۔ قادیانی کذاب تیرہ بختی کے سبب سامنے آنے کی جرأت نہ کر پایا۔ ورنہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کی نگاہِ کیمیا اثر نے اس

کے دل کی دنیا بدل جاتی۔ تائب ہوتا اور یوں اس کی عاقبت سنور جاتی۔

حیاتِ عزیز میں چشمِ کرم سے قلوبِ خلائق ، ہمیشہ مخزنِ انوار بنتے رہے۔ ایک گمنام نوجوان جسے لوگ مرید حسین کے نام سے جانتے تھے، غازی و شہید کے بلند رتبے پر فائز ہو کر دائمی شہرت کا معیار قائم کر گیا۔ دربارِ رسالت مآب ﷺ میں اسے قدومِ میمنت لزوم کے قریب جگہ ملی۔ ایسا مقام پایا کہ کونین کی دولت لٹا دینے سے بھی شاید ہاتھ نہ آئے، غازی مرید حسین، ناموسِ رسالت پر صدقِ دل سے فدا ہو گئے۔ کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ دیوانہ گر، اپنے دیوانے کی جدائی میں جل اٹھا۔ خوشا! یہ دیوانہ بھی کتنا خوش نصیب تھا، جس نے دیوانہ گر کو بھی اپنا دیوانہ بنا ڈالا۔

آخر یہ نادرِ روزگار ہستی، جسے اہلِ نظر قلندر کریمؒ اور اہلِ دل حضرات خواجہ محمد عبدالعزیز صاحب چاچڑویؒ کے حوالے سے جانتے ہیں ۷ / جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۸ء کو واصل بحق ہوئی۔

مدت سے ڈھونڈتی ہے کسی کی نظر مجھے
میں کس مقام پر ہوں نہیں کچھ خبر مجھے

غازی مرید حسین شہید نے اپنے خاص احباب پر مشتمل ایک انجمن تشکیل دے رکھی تھی۔ اس کا رکن بننے کے لیے یہ حلف اٹھانا پڑتا تھا کہ میں وقت آنے پر ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہوں گا۔ وفاداری شرطِ اول تھی اور یہی باضابطہ رکنیت کی سند قرار پائی۔ اس وقت لوگ عام طور پر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سر پھرے نوجوانوں کا ایک گروہ سمجھتے۔ المختصر انجمن کے مقاصد اور غرض و غایت کی فہرست درجِ ذیل ہے۔

☆ناموسِ رسالت ﷺ کا تحفظ اور عشقِ رسول ﷺ کا درس

☆آریہ سماجیوں کی یاوہ گوئیوں کا منہ توڑ جواب

☆مقامی مسلمانوں کی معاشی حالت کو سُدھارنا

☆اپنی قوم کے نوجوانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنا

☆ہر اس تنظیم سے تعاون وحمایت کرنا جو مسلمانوں کی بھلائی چاہے

مرید حسین ایک جدّت پسند اور فکری نوجوان تھے۔ انہوں نے پنجابی سے ملتی جلتی ایک زبان ایجاد کی اور حسبِ ضرورت ایک ذخیرۂ الفاظ بھی ترتیب دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ نے چند دوستوں کو بھی اس زبان کے اصول وقواعد سمجھائے اور جب وہ آپ کے پاس آتے تو اسی زبان میں گفتگو ہوتی اور پاس بیٹھے ہوئے دیگر لوگ کچھ نہ سمجھ پاتے۔ آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زبان دو طرح سے لکھی جاتی تھی۔ ایک پنجاب رسم الخط میں مگر عکسی طرز پر یعنی حروف کو الٹی طرف سے لکھتے اور دوسرا طریقہ الفاظ کو خفیہ بنانے کا تھا۔ ایک جگہ آپ نے اس خفیہ زبان کا نام انگریزی میں SAD-NANG-GADNU-AP-NAGE لکھا ہے۔

مولانا قاضی مظہر حسین صاحب (چکوال) کے قریبی حلقے نے اس امر کا دعویٰ کیا ہے کہ مولانا موصوف کے برادرِ حقیقی قاضی منظور حسین مرحوم نے خاکسار طرز پر "خدامِ اسلام" کے نام سے ایک مقامی تنظیم قائم کر رکھی تھی اور غازی مرید حسین شہید اس کے باقاعدہ رکن تھے۔ حالانکہ اس میں ذرّہ بھر بھی صداقت نہیں۔ تاہم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ قاضی منظور حسین، شہیدِ رسالت (ﷺ) غازی مرید حسین کے جہاد وعمل سے متاثر تھے۔

خونِ جگر سے جب جلادیا ایک دیا بجھا ہوا
پھر مجھے دے دیا گیا اِک دیا بجھا ہوا

غازی مرید حسین شہیدؒ کی کوشش ہوتی کہ ملکی حالات سے باخبر رہیں۔ آریہ سماجیوں کی خبریں اور ان کی سرگرمیوں پر مبنی رپورٹیں تو وہ غور سے پڑھا کرتے۔ ۱۹۳۶ء کی بات ہے ایک روز آپ نے "زمیندار" اخبار میں "پلول کا گدھا" کے عنوان سے ایک المناک خبر پڑھی۔ سرخی کے بعد تفصیل پڑھ کر اپنی رگوں میں خون کے بجائے بجلیاں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ خبر میں جو کچھ بتایا گیا اس کا تصور بھی بہت اذیت ناک تھا۔

اس خبر کے ساتھ ہی اخبارات میں احتجاجی بیانات کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ یہ طرزِ گستاخی اس قدر گمراہ کن اور زہر آلود تھی کہ جس نے بھی یہ الفاظ پڑھے گھائل ہو کر رہ گیا۔ اہل ایمان کے کلیجے چھلنی ہو گئے۔ اس پر مستزاد مولانا ظفر علی خاں کا تبصرہ اور الفاظ کا مزاج تھا۔ اُن کا قلم ایسے موضوعات پر لہو اگلتا رہا ہے۔ فقرات کیا تھے؟ ایک تیز آگ تھی، جس نے ہر مسلمان کو جلا کر رکھ دیا۔

ایک منجھے ہوئے صحافی کی طرح آپ نے اس ذلیل حرکت پر خوب نقد و نظر کی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی ایسی دیگر جسارتیں گنوائیں۔ نیز انہیں ناموسِ رسالت ﷺ پر مر مٹنے والوں کی عزت و سربلندی کا نظارہ کروایا۔ انہوں نے ہندوؤں پر واضح کیا کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی سیرت پر حرف گیری کا سلسلہ شروع کر کے ان کے عشرت کدوں میں کب تک قہقہے گونجتے رہیں گے۔ اگر شاتمان نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ وقت دور نہیں جب شمعِ رسالت ﷺ کے پروانے حسبِ سابق اپنی وفاؤں کے چراغ روشن کریں گے۔ دشمنانِ رسول ﷺ

کو یہ بھی یاد دلایا گیا کہ مسلمانوں نے اپنے آقا و مولا علیہ السلام کی توہین برداشت کی ہے اور نہ کسی وقت کریں گے۔

پھر دیکھیے حضور کی بندہ نوازیاں

با چشمِ نم، بہ قلبِ پشیمان جائیے

غازی مرید حسین شہید نے اپنے چند قریبی اور رازداں دوستوں کا ایک اجلاس بلایا اور خبر سے متعلق تمام صورتِ حال ان کے گوش گزار کی۔ معاملے کی نوعیت سے نماحقہ، آگاہی کے بعد جھامرے کے ایک غریب نوجوان...... محمد عارف نے جو پیشہ کے اعتبار سے جولاہا تھا، اپنا نام پیش کیا۔ چودھری خیر مہدی صاحب کے بقول اس کی رہائش جھامرہ نہیں میں چکوال تھی۔ انہوں نے حوالہ تعارف یہ کہہ کر مزید شک میں ڈال دیا کہ اس کا نام عارف یا صدیق تھا۔

ایک جواں سال مخلص مزدور اس نیت سے رختِ سفر باندھ رہا ہے کہ دور دراز کے علاقے میں اپنا سویا ہوا مقدر جگانے چلے۔ تاریخ کے صفحے پر میں نے یہ سطر بھی پڑھی ہے جو منصورؒ کے لہو سے تحریر ہوئی۔ لکھا تھا، جو سر دار نہ ہو وہ کبھی سردار نہیں ہوتا۔ مجاہدوں کی یہ ٹولی فلسفۂ زندگی سے آگاہ تھی۔ اس لئے عزتِ رسول علیہ السلام کا پاسبان، ہتھیلی پر اپنا سر سجائے شہیدِ کربلاؑ کے نقشِ قدم کو چومتا ہوا سوئے مقتل روانہ ہوا۔ سفر خرچ جو ستر روپے کے قریب تھا غازی مرید حسین شہید نے اپنی گرہ سے ادا کیا۔ یہ مسافر اپنی آنکھوں میں امیدوں کے دیپ جلائے بڑے ولولے اور جوش سے منزلِ شوق کی جانب رواں دواں تھا۔ اُسے خوشی تھی کہ وہ علامتِ باطل مٹانے جا رہا ہے۔ مگر یہ خدمت تو خدائے قدوس نے کسی اور کے سپرد کر رکھی تھی۔ اس کے مقدر میں صرف سفر لکھا تھا،

منزل کسی اور کے حصے میں آئی۔ ہوا یوں کہ تلاشِ شکار میں نکلنے والے شخص نے گوڑگانواں شہر پہنچ کر کسی راہ گیر سے "پلول" کا راستہ دریافت کیا۔ چہرے پر سفر کی تھکاوٹ کے آثار ہویدا تھے۔ اور کچھ مردود کے بارے میں شدید غصے کی علامتیں۔ راستہ بتانے والا ہندو تھا۔ اس نے مشکوک حالت دیکھ کر بھانپ لیا کہ یہ آدمی کچھ نہ کچھ کرنے جارہا ہے۔ اسے وٹرنری ڈاکٹر کے مذموم فعل کا بھی علم تھا اور مسلمانوں کے متوقع ردِ عمل کی خبر بھی۔ اس نے بہ عجلت ڈیوٹی پر متعین پولیس مین کو رپورٹ کردی۔ پولیس والے اسے گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔ تلاشی کے وقت خنجر برآمد ہوا۔ تفتیش کے دوران پولیس انسپکٹر نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟ کس کے پاس جانا ہے؟ اور یہ تیز دھار خنجر اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے؟ منزل سے دور رہ جانے والے مسافر نے آخری سوال کے جواب میں کفِ افسوس ملتے ہوئے جواب دیا: "شاتمِ رسول ﷺ کے ناپاک لہو سے خنجر کی پیاس بجھانے آیا تھا، قسمت نے بے وفائی کی ہے کہ اس سے پہلے ہی دھر لیا گیا۔ کاش! میں اس ذلیل کمینے ڈاکٹر تک پہنچ پاتا۔ مگر چھوڑنے والے ہم بھی نہیں، میں ناکام رہا تو عنقریب میرا کوئی دوست اس کی غلیظ زبان کاٹ کر رکھ دے گا۔ ہم نے یہ تہیہ کر رکھا ہے"۔

مجاہد جذبات کی رَو میں بہہ گیا۔ غصے کے سبب سب کچھ اگل دیا۔ اس واقعے کی اطلاع، اخبارات تک پہنچی۔ ڈاکٹر مردود اور اس کے رشتے داروں میں خوف وہراس پھیل گیا۔ ہر لمحے اسے موت کا سایہ اپنی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیتا، وہ اس سوچ میں پڑ گیا اگر ہزاروں میل کی مسافتیں پھلانگ کر اس نیت سے کوئی مسلمان یہاں تک پہنچ سکتا ہے تو میں مقامی مسلمانوں سے محفوظ کس طرح

رہ سکوں گا۔ "پلول" اور ارد گرد کے دیہات میں تمام مذاہب کے پیرو کاروں کی قریباً یکساں آبادی تھی۔

ڈاکٹر مذکور سر چھوٹو رام کا قریبی رشتے دار تھا۔ اس نے خطرۂ موت کے پیشِ نظر سیاسی اثر سے اپنا تبادلہ جلد ہی "پلول" سے "نارنوند" میں کروالیا۔ یہ ضلع حصار میں واقع ہے۔ تبدیلی کے احکامات پر عملدر آمد ہو گیا مگر یہ تمام کارروائی اس قدر صیغۂ راز میں رکھی گئی کہ محکمے کے بعض اہل کاروں سے بھی خفیہ تھی۔ تعیناتی کا نیا مقام بھی بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ ڈاکٹر رام گوپال ایک انتہا پسند اور کمینہ فطرت ہندو تھا۔ اور نتھو رام سندھی کو وہ اپنا قومی ہیرو خیال کرتا۔ اس لئے انہی کا راستہ منتخب کیا اور چلتے چلتے اپنے پیش رووں کی طرح جہنم رسید ہو گیا۔

نارنوند میں پہنچ کر وہ مطمئن تھا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اور مجھ تک کوئی نہیں پہنچ پائے گا۔ اس خود فریبی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس گاؤں میں مسلمانوں کے صرف دو گھر تھے اور وہ بھی نہایت غریب۔ بناء بریں اُسے تسلی تھی کہ اب کفن بردوش رضا کاروں کو میری جائے تقرر کا کسی طرح علم نہیں ہو سکے گا۔

غازی مرید حسین شہید اپنے ساتھی کو بغرضِ جہاد الوداع کر چکنے کے بعد گستاخِ مصطفیٰ کے قتل کی خبر کے منتظر رہتے تھے۔ اُن کا اضطراب روز بروز بڑھتا گیا۔ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ سینے میں ایک خلش سی بیدار رہتی۔ مختلف وسوسے پیدا ہوئے۔ کئی خیالات جنم لیتے۔ بالآخر انہیں یہ منحوس اطلاع ملی کہ نبی کریم ﷺ کے دشمن کا ناپاک وجود ابھی باقی ہے اور اُن کا مجاہد دوست،

پولیس کی حراست میں ہے۔

اس موقع پر آپ کے دل میں خیال آیا کہ خدمتِ محبوب ﷺ ویسے بھی غیر کے ہاتھوں جائز نہیں اگر اجازت ہوتی تو ان رعایت سے بادشاہوں کی جگہ اُن کے کارندے نمازیں ادا کیا کرتے۔ احساسِ ندامت سے اُن کی پلکیں شبنم سے سلگ اٹھیں۔ خانۂ دل، دولتِ درد سے بھر گیا۔ حضرت قبلہ غازی صاحب کی چشمِ بینا، روضۂ رسول ﷺ کو لرزتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کیفیت سے آپ کی کیا حالت ہوئی اور جذبات پر کیا گزری، اس کے بیان سے زبانِ قلم قاصر اور قوتِ اظہار عاجز ہے۔ اب اُن کی نگاہیں بلندیوں پر لگی تھیں۔ غیرت و خودداری کے جذبے نے تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ جذبہ جو انہیں نہ صرف تاریخ میں ایک مخصوص مقام دے گیا بلکہ اس سے مسلمانانِ ہند کو جداگانہ جغرافیے کا شعور بھی حاصل ہوا۔

یہ بے قراری اللہ کرے پوری ملتِ اسلامیہ میں بٹ جائے۔ کیسا ہی اچھا ہو اگر ان کا رونا، پوری قوم کو رُلا دے۔ دشمنِ اسلام نے مسلمانوں کو عشق رسول کی متاعِ بے بہا سے محروم کر دینا چاہا۔ وہ جانتا تھا، یہ دولت لُٹ جائے تو ایمان کی دنیا ویران ہو جاتی ہے۔ اگر مدھ بھرے نینوں سے عہدِ وفا نبھانے کا احساس مٹ جائے تو گویا مومن کا تمام اثاثہ چھن گیا۔

اب غازی صاحبؒ کو دو مسئلے درپیش تھے۔ ایک تو انہیں اپنے مجاہد ساتھی کی ضمانت کروانی تھی۔ سو جملہ اخراجات آپ نے برداشت کئے اور قانونی چارہ جوئی کا کام اُن کے لواحقین کو سونپ دیا۔ دوسرا نہایت اہم معاملہ بدزبان ہندو سے گستاخیٔ رسول ﷺ کا بدلہ لینا تھا۔ اس مقدس مشن کی تکمیل کا مرحلہ آپ

نے بذاتِ خود طے کرنے کا تہیہ کیا۔ یہ ارادہ باندھے زیادہ مدت نہیں گزری، ایک رات آپ استراحت فرما رہے تھے کہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اِدھر اُدھر بغور دیکھا، فضاؤں میں خوشبو رچ بس گئی تھی۔ جانے، دل کے کانوں سے آپ نے کیا بات سنی کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی کرنیں فروزاں تھیں۔ شاید چشمِ تصور، جلوۂ جاناں دیکھ آئی کہ امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ ساری رات آپ کی آنکھ نہ لگی۔ وقت تھا جو کٹنے کا نام نہ لیتا۔ یہ شبِ فراق تھی نہ ساعتِ وصال۔ اب کے قلب و نظر میں ٹھن گئی۔ دل کو آنکھ سے چشمک کہ اُسے لذتِ دیدار حاصل ہوئی۔ آنکھوں کو یہ اضطراب کہ دل سے یادوں کے سلسلے وابستہ ہیں۔

رات جیسے بھی کٹی، کٹ گئی۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ آپ کے ہاتھ میں قلم تھا۔ اور اپنی لال رنگ کی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہے تھے۔ بالآخر یہ کاپی اپنے سرہانے رکھی اور مطمئن ہو کر لیٹ رہے۔ فجر کی نماز ادا کی اور معمولات میں کھو گئے۔

غازی مرید حسین شہید نے اپنا دل آغاز سے ہی شیشے کی مانند شفاف رکھا ہوا تھا۔ اس تک کسی بھی بُت کی رسائی نہ ہو سکی۔ ان کی لوحِ قلب پر فقط ایک نام مرتسم تھا۔ شہید موصوف کے حسبِ حال، قمر الملت خواجہ قمر الدین سیالویؒ نے ایک بار فرمایا تھا:

"اگر ڈاکٹر معائنہ کرتے اور آپ کے دل کو چیرا جاتا تو اس پر بالیقین "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" ہی لکھا ہوتا"۔

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی لکھا ہو گا اگر مسلم کا دل چیریں"

ایک اور رات غازی صاحب نے رفیقۂ حیات کو اپنے پروگرام سے آگاہ

کرتے ہوئے بتایا

"مجھے اس امر کا حکم دیا گیا ہے کہ شاتم رسولؐ کا کام تمام کر دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بخوشی اس کی اجازت دے دیں۔ اور نہ صرف مجھے مسکرا کر خدا حافظ کہیں بلکہ میری کامیابی کے لئے بھی دعا کریں"۔

آپ کی اہلیہ نے جواب دیا

"میرے سرتاج! خادمہ کی خوشی، آقا کی رضا میں گم ہوتی ہے۔ کوئی بھی مسلمان عورت اس نیک کام سے منع نہیں کر سکتی۔ حضرت فاطمۃ الزہراء کی کنیزوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہروں کو خدمت اسلام کے لئے اکسائیں اور بہنیں پیارے بھائیوں کی قربانیاں پیش کیا کریں۔ میں آپ کو سرخرو دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ میرے لئے سربلندی کا سبب ہوگا۔ اس لئے میں، اپنے محبوب خاوند کے راستے میں روڑے اٹکانے کی جرأت نہیں کر سکتی"۔

غازی صاحب نے اپنا یہ پروگرام کسی اور پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس معاملے میں انہوں نے زبردست احتیاط برتی۔ والدہ محترمہ کو اس وجہ سے نہ بتایا کہ وہ رقیق القلب ہیں۔ نیز، اکلوتے بیٹے کا یہ زاویۂ نگاہ دیکھ کر کہیں گھبرا نہ جائیں۔

حضرت غازی صاحب نے اہلِ خانہ کو یہ کہہ کر رختِ سفر باندھا کہ وہ بھیرہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے قبلہ پیر صاحب کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوں گے۔ پھر ایک اور ضروری کام کرنا ہے۔ اس کے بعد واپسی متوقع ہے۔ الغرض آپ جون ۱۹۳۶ء کے آخری ہفتے میں گھر سے روانہ ہوئے۔

چاچڑ شریف کے موجودہ سجادہ نشین صاحبزادہ محمد یعقوب صاحب بتاتے ہیں کہ غازی مرید حسین شہید کی پہلی منزل چاچڑ شریف تھی۔ آپ پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں وہ اب بھی ایک راز ہے، جو کسی غیر کو معلوم نہیں۔ تاہم اتنا جانتے ہیں کوئی انتہائی اہم اور خاص بات تھی کہ جب آپ حضرت خواجہؒ سے مل کر باہر نکلے تو آنسو پونچھ رہے تھے۔ ہم نے ان سے بہتیرا پوچھا لیکن انہوں نے کچھ نہیں بتایا اور یہاں سے تشریف لے گئے۔ مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ غازی صاحبؒ کے چلے جانے پر قبلہ پیر صاحب بار بار اپنے مریدِ صادق کی کامیابی کے لئے دعا فرماتے۔ بعض اوقات تو پُر نم ہو جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ اپنے مرید کے خیال میں مستغرق ہو گئے ہیں۔ ہم حیران ہوتے یہ بھی کیا معاملہ ہے کہ مرید اپنے مرشد کو دیوانہ بنا گیا۔ اُس وقت تو ہم کچھ نہ سمجھ سکے مگر چند روز بعد یہ بھید کھل گیا کہ جب مرید حسینؒ الوداع ہوئے تو قبلہ پیر صاحبؒ ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر انہیں اُس وقت تک کیوں دیکھتے رہے، جب تک آپ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔

شاید یہیں کہیں ہو تیرا نقشِ پائے ناز
ہم نے گرا دیئے ہیں سرِ راہ گزار پھول

لیجئے یہاں تک تو غازی مرید حسین شہیدؒ کی سرگزشت، حالات و واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے اور روایات کے حوالہ سے بیان ہوئی۔ آگے اُن کی کہانی خود اُن کی زبانی سنئے۔

"یہ سفرِ شوق، انکشافِ ذات سے شروع ہوا اور عرفانِ ذات تک پہنچا۔ اس میں چاندنی کی سی ٹھنڈک ہے اور سورج کی سی تپش بھی۔

لمحہ لمحہ سوزو ساز سے معمور تھا تو قدم قدم رازونیاز سے آگاہ! ماہِ طیبہ کی کشش سے دل سمندر میں جوار بھاٹا کی اضطراری کیفیت کا پیدا ہو جانا یقینی ہوتا ہے۔ اس کا نام ایمان ہے اور حاصل ایمان بھی اسے ہی کہتے ہیں"۔

آپ نے بتایا:

"میں یہ تہیہ کر چکا تھا کہ محبوبِ خدا ﷺ کے گستاخ دشمن کو جہنم رسید کر کے واضح کر دوں گا کہ گو ہم میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی سی تڑپ موجود نہیں، تاہم اس قدر بے غیرت بھی نہیں ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر باچیانہ وناروا حملے کرنے والوں کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں۔ اس عزم کے ساتھ میں حضرت قبلہ پیر صاحب کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا۔ آپ خلافِ معمول اٹھ کر ملے، معانقہ کیا اور ماتھے کو چومتے ہوئے فرمایا:

"بیٹا! میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ تین دن سے آپ نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے۔ مبارک ہو، بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں آپ کو ایک نمایاں اعزاز کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے"۔

اس کے ساتھ ہی قلندر کریم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اور وارفتگی میں مجھے دوبارہ اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ بڑی دیر تک تخلیے میں رازونیاز کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں حیران ہوا کہ پورے تین دن سے مجھے بھی ذرا شکیب و قرار نہیں۔ آپ فرما رہے تھے "عزیز، مریدِ ناز

کی ذات میں اس طرح فنا ہو چکا ہے کہ مجھے جو بھی دیکھ لے گا، اُسے تمہارا دیدار ہو جائے گا۔ جاؤ! منزل تمہارے لئے مضطرب ہے۔ اور آستانے تمہاری جبین کو ترس رہے ہیں"۔

مردِ قلندر نے موت کے آئینے میں رُخِ دوست دکھا کر یہ زندگی میرے لئے اور بھی دُشوار کر دی۔ جی چاہا ایسی زندگی پاؤں جسے موت نہ آئے۔ میرا ہر قدم خود آگاہی سے خدا آگاہی کی سمت اٹھ رہا تھا۔ تمام راز فاش ہو گئے۔ آنکھیں بند کرتا تو تصورات میں اجالا پھیل جاتا اور نگاہیں وا ہوتیں تو منزل صاف دکھائی دینے لگتی۔ میری نظروں کے سامنے سے تمام حجاب اُٹھ گئے۔ میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا۔ اب میں جلد از جلد شاتمِ رسولؐ کے ٹھکانے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ چونکہ بھیرہ، تلوار بنے کو دے رکھی تھی، اس لئے وہاں سے قبل ازیں ہی ہو آیا۔ اس دوران مختلف مقامات سے اہل خانہ کو خطوط بھی لکھتا رہا۔ آج یہاں ہوتا تو کل وہاں۔ کئی جگہوں کے چکر کاٹے۔ سوچتا تھا خدا کی زمین کتنی وسیع ہے۔ پہلے اپنے دوست شیر محمد، نائیک سے راولپنڈی میں ملا اور ازاں بعد چلتے چلتے آزاد قبائل میں حاجی فضل احمد صاحب المعروف حاجی ترنگزئی کے پاس چلا گیا۔ میں نے خود کو جسمانی طور پر مضبوط بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اچھی خوراک کھاتا اور ورزش بھی کرتا۔ چند روز وہاں ٹھہرا رہا۔ میں نے اس کام میں سرخروئی کے لئے پلان کو ضروری خیال کیا۔ اندیشہ تھا منصوبہ بندی کے بغیر کہیں ناکام نہ ہو جاؤں۔ منصوبے کا پہلا مرحلہ ختم ہوا تو آزاد قبائل کے علاقہ سے چل پڑا۔

راستے میں پولیس والوں نے شک کا بہانہ بنا کر گرفتار کر لیا۔ زبردست

پوچھ گچھ کی مگر مجھ سے کچھ نہ اگلوا سکے۔ بھلا میں اپنا عزم کیوں کر بتاتا؟ غلام حسین نامی ایک پولیس افسر جو "اوھڑوال" چکوال سے تلہ گنگ روڈ پر واقع معروف قصبے کے رہنے والے تھے کو خفیہ تصدیق کی غرض سے ہمارے گاؤں بھیجا گیا۔ ان دنوں غلام حسین صاحب کا ایک بھائی اس جگہ بطور پٹواری متعین تھا۔ جب میرے سابقہ کردار سے مجرمانہ تشکیک کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا تو انہیں مجبوراً مجھے باعزت طور پر چھوڑنا پڑا۔ تین چار دن کی دلچسپ قید سے رہائی کے بعد راولپنڈی آ پہنچا اور کچھ وقت ایک تعلق دار کے پاس ٹھہرا رہا۔

یہاں سے قدم اٹھے تو کوئٹہ کی راہ لی۔ جانے کیوں، پولیس ہر جگہ میرا پیچھا کر رہی تھی۔ مجھے ایک پولیس چوکی لے جایا گیا مگر انہیں کوئی وجہِ گرفتاری نہ مل سکی۔ کوئٹے سے بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر لاہور آنا پڑا۔ اسلامیہ کالج کے ہاسٹل میں اپنے قریبی دوستوں محمد فیروز، شیخ رشید اور شیخ سخاوت کے کمروں میں قیام کیا۔ یہاں حضرت داتا گنج بخشؒ کے حضور حاضری دی۔ ایک روز اپنے ہم مسلک و ہم نظر، غازی علم الدین شہید کے مقبرے پر میانی صاحب بھی جا پہنچا۔ شہیدِ عشقِ رسول ﷺ کی آرام گاہ پر حاضر ہوا۔ دل کی دنیا میں ایک قیامت بپا تھی۔ یہاں میری کیا کیفیت ہوئی اور کتنی حقیقتیں منکشف ہوئیں، میں بیان نہیں کروں گا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے درمیان سے پردۂ لحد اٹھ گیا ہے اور ہم دونوں گلے مل رہے ہیں۔ میں نے اپنی کامیابی کی خاطر دعا کے لئے عرض کیا۔ انہوں نے مجھے مبارکباد دی۔

یہ سیاحت مکمل کر چکنے پر احساس ہوا کہ میں تلوار ہمراہ رکھ کر شاید اس مردود تک نہ پہنچ پاؤں۔ سو تلوار کو اپنے اسی دوست کے سپرد کر کے کہا کہ کبھی

میرے گھر پہنچا دینا اور خود دہلی کا رُخ کیا۔ وہاں چند لوگوں سے جان پہچان تھی۔ بھلہ کے ایک کوچوان حاجی طورا خان وہیں مقیم تھے۔ پورا ہفتہ ان کے ہاں اندرون کشمیری گیٹ چاندنی گنج کے مکان نمبر ۶۱۴ میں رہائش اختیار کئے رکھی۔ اس تاریخی شہر میں میرے ایک اور ہم مشرف آسودۂ خاک ہیں۔ سوچا، ان کی خاکِ قبر چوم آؤں۔ وارفتگی میں قدم اٹھے اور بے خودی کھینچ کر وہاں لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد قبرستان میں غازی عبدالرشید شہید کے حضور کھڑا تھا۔ جوش تھا جو تھمنے کو نہ آتا۔ اُن کے مقبرے کی پائنتی کھڑے ہو کر عہد کیا کہ آپ نے خونِ جگر سے جس باب کا عنوان رقم کیا تھا، میں اُس کی تفسیر لکھے بغیر دم نہیں لوں گا۔ شردھانند کا کوئی ہم فکر، جہاں بھی نظر آیا، آپ کے جذبے کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم رسمِ وفا نبھاتے رہیں گے۔ سچ ہے اہلِ درد کی قربت شراب کا کام دکھاتی ہے۔ یہ نشہ موت سے گھٹتا نہیں اور بڑھ جاتا ہے۔ اس گوشۂ راحت کے آس پاس بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔

یوں دیکھیں گے عارف اس کو

بیچ میں اپنی ذات نہ ہوگی

یہ تھی، غازی مرید حسین شہید کی مختصر کہانی خود اُن کی زبانی۔ اس سے بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے کہ شمعِ رسالت ﷺ کا یہ پروانہ مختلف علاقوں کے فاصلے بلا مقصد ہی ناپتا رہا۔ لیکن غور کیا جائے تو کسی اور ہی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ ہندو پہلے ہی غازی موصوف سے بہت بیزار تھے۔ ازاں بعد وہ آپ کے اس قدم سے بھڑک اٹھے کہ انہوں نے ڈاکٹر رام گوپال کو قتل کی غرض سے ایک مجاہد بھیجا۔ انہیں یہ بھی تسلی تھی کہ یہ غیور مجاہد گستاخِ

رسول ﷺ ناپاک وجود ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔ مقامی ہندوؤں نے اس امر کی اطلاع ڈاکٹر رام گوپال کو پہنچائی۔ اُسے یہ خوف لاحق ہو گیا کہ ایک کم سن جانباز میری موت کا پروانہ لئے پھرتا ہے۔ لہٰذا اس نے سر چھوٹو رام اور دیگر ہندو افسروں کی وساطت سے یہ انتظام کر لیا کہ پولیس کے ذریعے مرید حسین کی خفیہ نگرانی کی جائے۔ اب پولیس کے چند نوجوان شبانہ روز ان کی حرکات و سکنات اور سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ جب سرورِ کائنات ﷺ کا یہ غلامِ صادق بغرض جہاد روانہ ہوا تو اجنبی بن کر کئی اشخاص نے ان سے پوچھا: "آپ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں؟" قبلہ غازی صاحب بھی بڑے محتاط تھے۔ آپ کو جلد ہی اس گھٹن اور تعاقب کا احساس ہو گیا۔

اب ان کے سامنے ایک ہی راہ تھی کہ فی الحال کوئی اور روپ اختیار کیا جائے۔ اسی لئے انہیں مختلف علاقوں میں گھومنا پڑا۔ مگر آپ کا پیچھا ایک لمحے کے لئے بھی نہ چھوڑا گیا۔ ایک دو بار گرفتار بھی ہوئے اور کوئی معقول وجہ گرفتاری نہ پا کر چھوڑ دیئے گئے۔

اسلامیہ کالج کے ہاسٹل میں تلوار ایک دوست کے سپرد کی اور بھیس بدل کر پولیس کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد آپ چھپتے چھپاتے دہلی پہنچ گئے۔ یہیں سے آپ کی لافانی ولیری حیات کا آغاز ہوا۔ اب انہیں ثبوتِ وفا دینا تھا۔ مدت سے اُن کے دل میں ایک کسک اور چبھن تھی۔ اس خلش کے مٹ جانے کا وقت بالکل قریب آ رہا تھا۔ آپ اقبالؒ کی ہمنوائی میں اس حقیقت کا انکشاف کرنے والے تھے کہ مومن قاری نہیں، قرآن ہے۔

اب ساقیٔ کوثر ﷺ کے متوالے کو ایک نئی الجھن پیش آئی۔ ان

"پلول" پہنچ کر پتہ چلا کہ ڈاکٹر مذکور یہاں سے ٹرانسفر ہو کر کسی نا معلوم جگہ جا چکا ہے۔ آپ کو بے حد پریشانی ہوئی۔ فدا کارِ رسالت ﷺ اب اس ٹوہ میں لگ گیا کہ کسی طرح کم بخت کا سراغ ملے۔ آپ کو اس سلسلے میں کہاں تک کامیابی ہوئی، تین روائتیں ہیں جن سے صورتِ حال کا کھوج ملتا ہے۔

قیاس ہے حضرت غازی علیہ الرحمہ نے متعلقہ محکمے کے کسی آدمی کو اعتماد میں لے کر اپنے شکار کا نیا اسٹیشن معلوم کیا۔ دوسری روایت کے مطابق آپ ایک دن حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے مقبرۂ اقدس پر یہ حسرت لئے حاضر ہوئے تو ایک سفید پوش اور نورانی صورت بزرگ نے فرمایا "بیٹے! ضلع حصار کے گاؤں نارنوند چلے جاؤ، تمہاری مرادیں بر آئیں گی"۔ تیسری روایت جو اچھوتی ہے اور دلچسپ بھی، اس سے ایمان کو حرارت ملتی ہے اور دل کو تڑپ۔ بیان ہے آپ نے تلاش میں ناکام ہو کر مدینہ منورہ کی طرف رُخ کیا اور کرب سے چیخیں نکل گئیں۔ آنسوؤں کے الفاظ میں اپنے آقا و مولا ﷺ کے حضور استغاثہ کیا۔ اسی رات نبی کریم رؤف الرحیم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ نے دہن دراز ڈاکٹر کے موجودہ ٹھکانے کی واضح نشاندہی فرما دی۔

مندرجہ بالا روایات پر غور کرنے سے اوّل الذکر قیاس نامعتبر ٹھہرتا ہے اس لئے کہ میتہ روداد میں ہم حضرت قبلہ غازی صاحبؒ کی احتیاط و رازداری کا منظر دیکھ چکے ہیں۔ ثانی البیان میں بلاشبہ صداقت کے پہلو موجود ہیں۔ بنا بریں اگر مجاہد ملت کا بلند مرتبہ و عشقِ رسول ﷺ پیشِ نگاہ رہے تو آخر الذکر روایت نہ صرف مبنی بر حقیقت معلوم ہوتی ہے بلکہ دل کی دھڑکنیں بھی اس پر گواہ ہیں۔ پیارے نبی ﷺ کے حضور سے بشارت ملنا اس امر کی دلیل تھی کہ منزل

تک پہنچنے میں بالشت بھر سفر باقی ہے۔

خدا گواہ کہ کانٹوں پہ رقص کرتے ہیں
چمن چمن کا مقدر سنوارنے والے

ملّتِ اسلامیہ کے شاہین نے شکار پر جھپٹنے کے لئے پر تولے اور ۶۔ اگست ۱۹۳۶ء کو دہلی سے محوِ پرواز ہوا۔ "حصار" دہلی سے ۱۰۲ میل مسافت پر واقع ہے اور نارنوند یہاں سے قریباً تیس پنتیس کوس دور ہو گا۔ غازی صاحب دہلی سے ٹرین پر سوار ہوئے اور ہانسی اسٹیشن پر اترے۔ انہیں صرف تین چار میل آگے جانا تھا۔ آپ نہر کی پٹڑی پر پیدل چل پڑے۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ افق سے سرخی مائل رنگت آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔

سُنا ہے اجالوں کی سمت سفر کرنے والوں کی اندھیرے بھی قدر کرتے ہیں۔ غازی صاحب نے یہ رات باہر درختوں کے ایک جھنڈ میں گزاری۔ علی الصبح گاؤں میں داخل ہوئے۔ اس جگہ مسلمانوں کے فقط دو گھر تھے۔ یہاں مسجد بھی نہیں تھی۔ کسی طرح معلوم کر کے ایک مسلمان جو پیشے کے لحاظ سے تیلی تھا، کے گھر چلے گئے۔ میزبان نے انہیں مسافر سمجھ کر خوب آؤ بھگت کی۔ باتوں باتوں میں آپ نے گاؤں کے حالات اور دیگر ضروری معلومات حاصل کیں۔ فجر کی نماز ادا کر چکنے پر آرام کیا۔ دیر گئے بیدار ہوئے۔ غسل سے فارغ ہو کر نیا لباس پہنا۔ ناشتے سے تھوڑی دیر بعد چہل قدمی کا بہانہ بناتے ہوئے ان سے کہا: "میں ابھی آتا ہوں"، اور باہر نکل گئے۔ جمعرات کے دن ظہر کی نماز کے بعد آپ نے جامع مسجد دہلی کے باہر سے تین روپے میں ایک چاقو خریدا۔ اس کا دستہ پیتل کا تھا اور پھر سان سے خوب تیز کرایا گیا۔ چار بجے شام دہلی سے حصار جانے والی بس پر

سوار ہوئے۔ طوراخان کے چھوٹے بیٹے غلام محمد کی ہاکی بھی ساتھ لیتے گئے۔

۷۔اگست ۱۹۳۶ء کو جمعہ کا روز تھا۔ آپ اس انداز سے ہسپتال کے قریب پہنچے کہ کوئی شک نہ کر سکے۔ اپنی چھوٹی سی نوٹ بک نکال کر ایک محفوظ جگہ کھڑے ہو گئے اور آنے جانے والوں کو بغور دیکھتے رہے۔ آپ کی احتیاط اور جگہ کے انتخاب کی خوبی تھی کہ اُن میں سے کوئی شخص بھی دیکھ نہ سکا۔ بالآخر ایک ہے کٹے آدمی پر آپ کی نظریں ٹک گئیں۔ یہ وہی بدنامِ زمانہ گستاخ ڈاکٹر تھا، جس نے نبی پاک ﷺ کے اسمِ مبارک کی توہین کی۔ اور جس کے متعلق سرکارِ مدینہ ﷺ نے بھلہ کے غلام کو اسے موت کا ذائقہ چکھانے کو فرمایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک بار مریدِ عزیزؒ نے آدھی رات کو اٹھ کر کاغذ کے پُرزے پر اسی بدقسمت کا حلیہ درج کیا تھا۔ اس شب آپ آقائے مدنی ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ رسولِ عربی ﷺ نے ہی اپنے ہندی دیوانے کو اس کا ناک نقشہ لکھوایا۔ یہ بھی اُنھی کی نظرِ کرم کا اعجاز تھا کہ مرید حسین، غازی کے روپ میں اس ملعون کا پیٹ چاک کرنے کی نیت سے یہاں موجود تھے۔

شہبازِ عشق، اپنے رسول ﷺ کے دشمن کو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ اس ناپاک کو دیکھنا تھا کہ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جی میں آیا کہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر اسے موت سے دوچار کر دیں۔ مگر آپ جوش میں آکر ہوش نہیں کھونا چاہتے تھے۔ کون برداشت کر سکتا ہے کہ اتنے عرصے کی محنت اکارت چلی جائے۔ انہیں کامل یقین ہو گیا کہ یہ وہی ڈاکٹر ہے جسے وہ اتنی مدت سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ پوری تسلی اور پختہ ایمان کے بعد آپ دوبارہ میزبان کے ہاں آگئے۔ نماز ادا کی۔ خداوندِ قدوس کے حضور رو رو کر اپنی کامیابی و کامرانی کے لئے دعا

مانگتے رہے۔ اپنے میزبان کو یہ کہہ کر الوداع ہوئے: "میرے یہاں ٹھہرنے کے بارے میں کسی کو مت بتانا، نہیں تو مصیبت میں گھر جاؤ گے"۔

ہسپتال کے ارد گرد گھنے درختوں کی قطاریں تھیں۔ جب غازی صاحب وہاں تشریف لے گئے تو ڈیوٹی کا مقررہ وقت ختم ہونے کو تھا۔ آپ نے ایک جگہ کھڑے ہو کر دیکھا کہ ۱۰ فٹ دور نیم کے درخت کے سائے میں اس کی بیوی دیوی کشیدہ کاری میں گم ہے۔ تقریباً ۲ فٹ دور ایک کمپوڈر سویا ہوا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ عملہ کے افراد تاش کھیل رہے تھے اور بعض گپیں ہانک رہے تھے۔ قریب بیٹھے چند افراد غالباً شطرنج کھیل اور دیکھ رہے تھے مگر رام گوپال کو اخبار پڑھنے میں مصروف پایا گیا۔ شیر دل مجاہد موقع کی تلاش میں رہا۔ ڈاکٹر مذکور مطالعہ کرتے کرتے چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اس نے اپنا مکروہ چہرہ اخبار سے ڈھانپ رکھا تھا۔ بے جان مہروں کا کھیل ختم ہو چکا تو باتوں میں مگن نوجوان بھی ہولے ہولے کھسکنے لگے۔

غازی صاحب آپے سے باہر ہو چکے تھے۔ اب مزید انتظار اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ اس فتنے کو ابدی نیند سلا دینا چاہتے تھے۔ بقول اُن کے :

"میں موقع غنیمت جان کر گیٹ میں داخل ہوا۔ میرے پاس ایک ہاکی اور کمانی دار چاقو تھا۔ کاندھے پر چادر لٹکی تھی۔ چند لمحوں کے لئے میرے دل میں خوف پیدا ہو گیا۔ شیطان نے ورغلایا: یہ تمہاری نسبت صحت مند و توانا ہے اور تم کوئی موزوں آلۂ قتل بھی نہیں رکھتے، کہیں ایسا نہ ہو یہ بچ رہے اور تم مارے جاؤ۔ ایک لمحے کے لئے ماں کا خیال بھی آیا۔ مگر دوسرے لمحے میں الشیطانی وسوسوں پر قابو پا چکا

تھا۔ سوچا میں عزرائیل تو ہوں نہیں کہ اسے ضرور موت سے دوچار کر سکوں۔ لیکن اپنا فرض تو ادا کر جاؤں گا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ملعون میرے وار سے بچ نہیں سکے گا۔ اس کے بعد میرے مقدر میں اجالے اور روشنیاں لکھی جائیں گی"۔

غازی صاحبؒ نے راجپال کے مقلد کو سوتے میں ہلاک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ گستاخ و مردود موت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کل تک یہ ہنستا تھا، ہم روتے رہے ہیں۔ آج یہ آہ و بکا کرے اور میں قہقہے لگاؤں۔

اب آوارہ کتے کی ہلاکت یقینی تھی۔ غازی دین وملت اس کے سر پر کھڑے تھے۔ چاہتے تو ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیتے۔ مگر آپ نے مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے پاؤں کی ٹھوکر ماری اور للکارتے ہوئے کہا:

"او گدھے کے موذی بیٹے! اٹھ اور اپنا انجام دیکھ! آج تجھے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے رسولِ عربی ﷺ کا غلام تیرے سامنے کھڑا ہے"۔

وہ پھڑک کر اٹھا اور دہشت سے نیچے گر رہا تھا کہ آپ نے زور سے نعرۂ تکبیر لگا کر چاقو اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ زخمی کی چیخ بلند ہوئی نہ ہائے ہائے کی آواز اٹھی۔ غازی صاحب نے اللہ اکبر اتنے زور و جوش سے کہا تھا کہ جسے سن کر ڈاکٹر کے بیوی بچے شور مچاتے ہوئے باہر کی طرف دوڑے۔ یہ واویلا دور دور تک پہنچا۔ آپ کے دل میں خیال گزرا کہ میرا وار خالی گیا ہے وگرنہ مقتول ضرور تڑپتا پھڑکتا یا چیختا چلاتا۔

ملتِ اسلامیہ کا ہیرو یہ سوچ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ دراصل آپ اسے

جہنم رسید کرنے سے پہلے گرفتار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ جائے واردات سے قریباً فرلانگ بھر اُدھر آپ نے چاقو ایک تالاب میں پھینک دیا اور خود بھی چھپ کر بیٹھ رہے۔ لوگ اُن کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ہر طرف بھگدڑ مچی تھی۔ ایک ہندو یہ کہتے ہوئے دوڑ رہا تھا "ڈاکٹر مر گیا ہے۔ ارے لوگو! کوئی ڈاکٹر کو مار گیا ہے"۔ یہ کیف آور اور سرور بخش بات آپ کے کانوں میں رس گھول گئی۔ احساس کے آنگن میں نقرئی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ انہیں اس قدر مسرت ہوئی کہ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور پوچھنے بنی "کیا ڈاکٹر واقعی مر چکا ہے؟" اس نے روتے ہوئے کہا "اور کیا؟" اس خوش کن خبر سے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پھول کھل اٹھے اور خوشی کی کیفیت میں دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ لوگوں کو پکار پکار کر کہا:

"رام گوپال کا قاتل میں ہوں۔ میں نے ہی اسے دوزخ کا ایندھن بنایا ہے۔ یہ میرے رسول ﷺ کا گستاخ تھا۔ سو میں نے بدلہ چکا دیا۔ اب مجھے کسی بات کا ڈر ہے نہ خوف!"۔

آپ تالاب کے درمیان میں جا کھڑے ہوئے۔ کمر تک پانی تھا۔ ہندوؤں نے ان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ اس موقع پر آپ نے نہایت پامردی کا ثبوت دیا۔ جرأت مندی کے ساتھ ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اگر تم میں سے کسی نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو اس کا حشر بھی عبرتناک ہوگا"۔ البتہ اپنی گرفتاری کے لئے اس شرط پر رضامند ہوئے کہ کوئی مسلمان پولیس افسر ہی مجھے ہتھکڑی پہنائے گا۔

ہندو خوف زدہ ہو چکے تھے۔ ایک آدمی بھاگتا ہوا پولیس سٹیشن گیا اور

تھانے میں ابتدائی رپورٹ درج کروائی۔ چنانچہ تار نوشتہ میں متعین ایس ایچ او چودھری احمد شاہ کھوٹ (والد بزرگوار، چودھری محمد افضل صاحب کھوٹ، سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج چکوال و ڈی ایس پی آفیسر حکومت پاکستان) نے آپ کو اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلا کر گرفتار کیا اور ہتھکڑی پہنائی۔

آپ کے مخلصانہ عمل سے حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل ہی مٹنے والی شے ہے۔ جرأت و غیرت مندی کی انتہا عشق و مستی کے باب کی ابتدا ہے۔ اس دور کا آغاز لحہ گرفتاری اور نہایت مرحلۂ شہادت ہے۔

یاد آنہ جائے مقتلِ یاراں کی رات پھر
نیزے پہ کوئی سر نہ سجا میرے سامنے

☆☆☆

تھانے میں ابتدائی رپورٹ کے بعد کیس کا باقاعدہ اندراج بیوہ رام گوپال کی طرف سے ہوا۔ انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں نے جائے واردات کا معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ خون کا کوئی قطرہ مٹی میں جذب ہوا نہ ہی اس کا نشان مقتول کے لباس پر ملتا تھا۔ کوائف کی خانہ پری اور پارچات کی تکمیل پر مقتول رام گوپال کی نعش پولیس نے خاص اپنی نگرانی میں ہسپتال پہنچائی۔ سول سرجن نے مردے کا پوسٹ مارٹم کیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا :

"حملہ اتنا شدید اور زخم اس قدر گہرا تھا کہ تمام آنتیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ اس گھاؤ سے مقتول کا بچنا محال تھا۔ جسم کی اندرونی ساخت اور ظاہری حالت سے منکشف ہوتا ہے کہ مقتول پر حملہ آور کی دہشت کے سبب سکتہ طاری ہو گیا۔ چونکہ اس سے خون خشک ہو چکا تھا اس لیے تنِ مردہ پر لہو کا ایک دھبہ یا داغ نہ ہے۔ یہ زخم کسی تیز دھار آلۂ قتل کا لگا ہوا ہے۔ اگر چاقو کا پورا پھل سینے میں اتر جائے تو بھی ایسا زخم لگ سکتا ہے۔ لباس پر خون کے نشانات موجود نہ ہیں، تاہم بنیان پر ایک کٹ واضح ہے۔ آلۂ قتل اسی کو پھاڑ کر سینے میں داخل ہوا ہے۔"

ڈاکٹری معائنہ کے بعد میت ورثاء کے حوالے کر دی گئی جنہوں نے اگلے روز اسے سپرد آتش کر دیا۔ گستاخ اپنے کی سزا پا گیا۔ اور نوجوان مجاہد جزاء کے لئے مضطرب تھا۔ جو زندگی کے تعاقب میں بھاگتا رہا وہ پنجۂ موت کی گرفت میں دم توڑ چکا تھا۔ جس نے موت سے بے نیازی برتی وہ ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا۔

رام گوپال کا قتل ہونا تھا کہ ہندو جرائد نے سنسنی خیز سرخیاں جمانا شروع کر دیں۔ کسی نے اس واقعے سے مسلم تنگ نظری کا جواز پیش کیا۔ بعض نے اسے جاہل مسلمانوں کا جنون اور انتہا پسندی قرار دیا۔ کچھ کو یہ اقدام، تقسیم ہند کا شاخسانہ نظر آیا۔ الغرض ان کے ذہن میں جو آیا لکھ دیا۔ آریہ سماجیوں کے اخبارات ملزم کو سخت سے سخت سزا دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مخالفوں کا واویلا، غازی صاحب کی شہرت کا سبب بنتا گیا۔ جوں جوں فرزندان اسلام کو آپ کے کارنامے کا معلوم ہوتا گیا، وہ آپ کی طرف کھنچتے چلے آئے۔

اب جسے دیکھو آپ کا دیوانہ۔ ہر اک کی زبان پر یہی نام۔ کیوں نہیں، رشتۂ محبت میں منسلک، محبوب کو دیکھنے والی آنکھوں سے بھی پیار کرتے ہیں۔

تو نے کیا نقش سجا رکھے ہیں چہرے پر
دیکھتے رہتے ہیں تیرے طلب گار مجھے

حضرت قبلہ غازی صاحب کو گرفتار کر کے جامہ تلاشی لی گئی تو آپ کی جیب سے ایک نوٹ بک ملی، جس پر ڈاکٹر رام گوپال کا پورا حلیہ درج تھا۔ اس بارے میں آپ سے خاصی پوچھ گچھ کی گئی۔ ابتداً انہوں نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ جب پولیس والوں کا تجسس ختم نہ ہوا تو آپ نے فرمایا:

"جس عظیم ذات نے مجھے اس امر کی اطلاع فرمائی ہے اور مردود ڈاکٹر

کی غائبانہ شناخت کرائی۔ ان کے حضور تم تو کیا تمہارے خیال کا گزر بھی نہیں ہو سکتا۔ مقتول نے میرے رسول ﷺ کو تکلیف پہنچائی تھی، آپ ﷺ کا کرم ہوا، میری قسمت جاگ اٹھی۔ ایک رات نورِ مجسم، رحمتِ دو عالم، نبی کریم، رؤف رحیم آقا ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ خواب میں مجھے مقتول ڈاکٹر کی مکروہ صورت دکھائی گئی۔ میں نے اسے اچھی طرح پہچان لیا۔ اسی وقت اٹھا اور حلیے کو جامہ الفاظ پہنایا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بمشکل اس کے گریبان تک پہنچا اور اللہ اکبر کہہ کر گستاخ کا کام تمام کر چکا ہوں۔ یہ میرا فریضہ تھا۔ آگے آپ کا کام ہے۔ جس طرح جی چاہے قانونی تقاضے پورے کریں۔"

"غازی صاحب" کو حراست میں لینے کے بعد پیدل جائے واردات کی طرف لایا گیا۔ تھانیدار کے ہمراہ مقامی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ راستے میں دونوں نے انگریزی میں باتیں کیں۔ ایک دفعہ ہیڈ ماسٹر نے تھانیدار کی طرف متوجہ ہو کر انگریزی میں کہا:

"ملزم بچہ ہے جس طرح ہم کہیں گے بیچارا مان جائے گا"۔ یہ سن کر آپ نے بآوازِ بلند کہا: "جو میرا جی چاہے گا کہوں گا اور کروں گا، میں تمہاری باتوں پر چلنے والا نہیں"۔

جائے وقوعہ سے قواعد کے مطابق پارسل تیار کیے گئے۔ مقتول کی نعش تھانے پہنچائی گئی۔ پولیس اسٹیشن کے صحن میں قدم رکھتے ہی غازی صاحب" نے ایس ایچ او سے کہا: "مجھے پیاس لگی ہے، پانی پلاؤ۔ نیز کھانے کی احتیاج بھی ہے، اس لیے روٹی کا بندوبست کرو۔ دوسرا کام میرے کپڑوں کی صفائی اور غسل کا ہے

کیونکہ میں نے ایک ناپاک وجود کو واصل جہنم کیا ہے جس سے میرا لباس اور جسم ناپاک ہیں۔ تھانیدار صاحب نے تعمیل ارشاد کی۔ آپ شکرانے کے نفل پڑھ چکے تو نمازِ عصر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ ان کا سر بڑی دیر تک اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھکا رہا۔

تھانیدار کو ہم علاقہ اور مسلمان ہونے کے سبب آپ سے ہمدردی تھی۔ غازی صاحبؒ کی باتوں نے بھی اسے بہت متاثر کیا۔ بہر حال رسمی کارروائی پوری کی گئی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ رام گوپال کو کیوں قتل کیا ہے؟ انہوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ استفسار کیا گیا "ہنس کیوں رہے ہو؟" آپ نے قدرے جذباتی ہو کر فرمایا: "کیا روؤں؟ میں تو ایک مدت سے ان کے پیچھے تھا۔ اب میرے ہنسنے اور ہندوؤں کے رونے کا موسم ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ میری مراد پوری ہوئی"۔

تفتیشی افسر نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: عاشقِ رسول ﷺ۔

پولیس افسر: میں تمہارا اصل نام پوچھ رہا ہوں؟

(افسر ہندو تھا)

غازی صاحب: رسولِ عربی ﷺ کا شیدائی، مرید حسین۔

پولیس افسر: تمہارا چاقو کہاں ہے؟

آپ نے نشاندہی فرمائی کہ فلاں کنارے کے قریب پانی میں پڑا ہے۔ انہوں نے اپنا آدمی بھیج کر وہاں سے تلاش کروایا اور یہ آلۂ قتل اپنے قبضہ میں لے لیا۔

چونکہ غازی مرید حسین کے ساتھ ایس ایچ او کا رویہ بہت اچھا اور

قابلِ قدر تھا۔ اس نے آپ کی عزت واحترام میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اگر کوئی بات بھی پوچھنا ہوتی تو مرتبے کا لحاظ رکھتا۔ اس سے ہندوؤں کو شک گزرا کہ وہ بھی اس سازش میں ملوث ہے۔ آریہ سماجیوں سے ہم آہنگی رکھنے والوں نے فی الفور ایک خفیہ میٹنگ بلائی۔ اس میں سرکردہ وچیدہ چیدہ افراد نے شرکت کی۔ تمام ہندوؤں نے یہ تجویز پسند کی کہ رات گئے، مرید حسین کو حوالات سے اغوا کر کے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ دوسری طرف تھانیدار پر یہ الزام تھوپ دیا جائے گا کہ ملزم اس کے تعاون سے روپوش ہو چکا ہے۔ انہوں نے تمام انتظامات نہایت رازداری کے ساتھ مکمل کیے مگر کسی طرح تھانیدار کے علم میں بھی یہ بات آگئی۔ اس نے نہ صرف پہرے کا انتظام سخت کر دیا بلکہ یہ تمام معاملہ اعلیٰ افسروں کے نوٹس میں بھی لایا۔ بالآخر وائرلیس پر طے شدہ فیصلے کے مطابق رات کے پہلے حصے میں غازی صاحب" کو جیپ میں ڈسٹرکٹ جیل "حصار" بھیج دیا گیا۔ یوں ہندوؤں کو بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

غازی صاحب" ابتدائی دنوں میں لواحقین کو متواتر اپنی خیریت سے آگاہ کرتے رہے، پھر وقفے پڑنے شروع ہوئے۔ مگر جوں جوں آپ منزلِ مراد کے قریب تر ہوتے گئے، خط و کتابت کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ آپ کو اندیشہ تھا، خطوط سے کہیں پولیس کو میرا سراغ نہ مل جائے۔ رشتے دار آپ کی سرگرمیوں سے بالکل بے خبر تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ آج کل غازی صاحب کہاں ہیں؟ اور ان کا اگلا قدم کیا ہوگا؟

واقعۂ قتل ۷۔ اگست ۱۹۳۶ء کو رونما ہوا۔ دوسرے روز نارنوند پولیس اسٹیشن کا ایک ملازم گوپی نامی بغرضِ تفتیش تھانہ چکوال سے بھلہ شریف آیا کہ

معلوم کرے، ملزم واقعتاً اسی جگہ کا رہائشی ہے یا کہیں اور کا۔ اہل دیہہ اپنے اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ عائشہ بی بی کی آنکھیں آج بھی دروازے پر لگی تھیں کہ شاید میر الحق جگر آجائے۔ اے ایس آئی کی اچانک آمد اور مرید حسین سے متعلق سوالات نے لوگوں کو چونکا دیا۔ جب اُس نے بتایا کہ آپ ایک ڈپٹی زی ڈاکٹر کے الزام قتل میں گرفتار ہو چکے ہیں تو یہ خبر پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی تیزی سے پھیل گئی۔ کسی کو غم ہوا کہ ماں باپ کا اکلوتا فرزند تھا۔ بعض نے شادی کے حوالے سے باتیں کیں۔ چند نے کہا اپنے نام کو زندہ جاوید کر گیا ہے۔ والدہ حیران تھیں، کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ عزیز و اقارب پریشان ہو گئے مگر آپ کی زوجہ محترمہ نے آپ کی کامیابی کی خبر سن کر اپنا سر بارگاہِ ایزدی میں جھکا دیا اور شکرانے کے نفل ادا کیے۔ صورتِ حال سے آگاہی کے بعد غازی صاحب کی والدہ محترمہ، چوہدری خیر مہدی صاحب، آپ کے بے تکلف دوست اور منہ بولے بھائی محمد بخش صاحب جو قریبی گاؤں تھرپال کے رہنے والے تھے، کے علاوہ بعض دیگر تعلق دار بھی ۱۱۔ اگست کو حصار پہنچ گئے اور اسی روز ملاقات کی۔ یہ مختصر قافلہ زیارت کے لئے ڈسٹرکٹ جیل میں حاضر ہوا تو آپ ہنس پڑے اور فرمایا ”آپ لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا ہے؟ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آپ نے دھیمے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا: ”چلو اچھا ہوا، اس طرح ملاقات تو ہو گئی“۔ کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بعض اوقات ملاقاتیوں کی آواز رندھیا جاتی۔ لیکن آپ تسلی و تشفی دیتے۔ وہ خوش ہوتے تو انہیں بھی چین آجاتا۔ آپ نے والدہ محترمہ سے عرض کیا: ”ماں! میں نے یہ پروگرام اس لئے خفیہ رکھا تھا کہ کہیں آپ مجھے اس راہ پر چلنے سے روک نہ دیں۔ آپ کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ

آپ کے بیٹے کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ اگر میں نے کبھی خدمت میں کوئی کوتاہی کی ہے تو معاف فرما دینا اور میری قربانی کی قبولیت کے لئے دعا فرمانا۔ مجھے یقین ہے آپ والدہ شہید کے حوالے سے دربارِ نبوت میں خصوصی اعزاز کی مستحق ٹھہریں گی"۔ ارکانِ وفد بتاتے ہیں "غازی صاحب کی والدہ صاحبہ نے خلافِ توقع بڑی حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا۔ دورانِ سفر اُن کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ ہر لحظہ شدتِ غم سے گھبرا اٹھتیں۔ مگر بیٹے کے سامنے جا کر خوش خوش نظر آنے لگیں۔ اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے چین کا منہ سر چوما اور محبت بھری باتیں کیں۔ بے چینی ظاہر ہوئی نہ آنکھوں سے آنسو ٹپکے۔ بڑا ایمان افروز منظر تھا۔ دیکھنے والے جگر تھام کر رہ گئے۔

دوسرے روز ۲۱ اگست کو دوبارہ ملاقات کا بندوبست ہوا۔ غازی صاحبؒ نے فرمایا:

"آپ لوگ واپس چلے جائیں، مقدمہ سیشن سپرد ہونے پر میں خود ہی یاد کر لوں گا۔ اس طرح ایک تو ملاقات ہو جائے گی اور بعض دوسرے مسائل بھی زیرِ بحث آجائیں گے"۔

اس بات پر چودھری خیر مہدی صاحبؒ بول پڑے "ہم ان شاء اللہ مقدمے کی پیروی کریں گے۔ وکیل سے بات ہو چکی ہے۔ ہمیں تسلی ہے کہ آپ بری ہو جائیں گے"۔

یہ سن کر غازی صاحب زیرِ لب مسکرائے اور فرمایا:

"میں نے اُسے دن دیہاڑے دو تین بجے کے قریب قتل کیا ہے۔ پولیس کے سامنے اعترافِ اقدام بھی کر چکا ہوں اور عدالت میں بھی

میرا موقف یہی ہو گا۔ اب بتاؤ کہ آپ کی چارہ جوئی اور وکیل صاحب کی قانونی موشگافیاں کیا کر سکیں گی۔ مناسب ہے اپنا وقت اور سرمایہ ضائع نہ کرو۔ پردیس میں کیوں پریشان ہوتے ہو۔ آپ چلے جائیں میں وقتاً فوقتاً خط لکھتا رہوں گا"۔

چودھری صاحب بضد ہوئے "آپ اقبالی بیان نہ دیں۔ پولیس کے سامنے دیئے گئے بیانات سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ مگر عدالت میں ایسی غلطی کا ارتکاب ہرگز نہ کریں"۔ حضرت غازی مرید حسینؒ کے لہجے میں قدرے خفگی آگئی اور فرمایا:

"میں اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہوں۔ آگے آپ کی مرضی، میں کسی صورت بھی صحتِ مقدمہ سے انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرے مسائل آپ جس طرح چاہیں خود نپٹا لیں"۔

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

اس واقعۂ قتل کی تفصیلات و جزئیات ہندوستان کے تمام اہم اخبارات میں شائع ہوئیں۔ ہندو جرائد نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینا چاہا۔ کئی پرچوں میں عجیب و غریب سرخیاں جمیں۔ لیکن روزنامہ "زمیندار" کا رنگ منفرد تھا۔ اس کے اوّلیں صفحات پر صحیح صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا۔ مضمون نگار نے انتہا پسند ہندوؤں کی گستاخیاں گنوائیں اور آئندہ کے لئے بھی تنبیہ کی۔ خبر کے ساتھ یہ بھی درج کیا گیا کہ غازی صاحبؒ موصوف کو پہلے روز ہی ڈسٹرکٹ جیل حصار میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اس سے غازی ملت پورے ملک میں موضوعِ گفتگو بن گئے۔

ملاقات کی غرض سے جیل کے ارد گرد ہر وقت ایک جم غفیر جمع رہتا۔ دور دور سے مسلمان آپ کی زیارت کے شوق میں کھنچے چلے آتے۔ حصار میں دیکھتے ہی دیکھتے کئی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ محلہ وار کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ طالب علموں اور دیگر مسلم نوجوانوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ لوگ باہر سے آنے والے قافلوں کے قیام وطعام کا بندوبست کرتے۔ ان کے پروگرام میں غازی صاحبؒ کے لواحقین کا پرجوش استقبال، ان کی ضروریات کا خیال اور مرافعے میں تعاون شامل تھا۔ بیک وقت کئی گھروں سے کھانا پک کر آتا، جسے آپ مسلمان قیدیوں میں تقسیم فرمادیتے۔ چند ہی دنوں میں یہ وفا کیش مجاہد، پوری قوم کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ اب آسمانِ شہرت پر آپ کا آفتابِ اقبال پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

غازی صاحب موصوف سے ابتدائی ملاقاتوں اور قانونی چارہ جوئی کے سلسلے میں چودھری خیر مہدی صاحب کا بیان نہایت اہم اور قیمتی معلومات پر مبنی ہے۔ بقول ان کے ''مقدمے کی پیروی میرے ذمے تھی۔ ہمارے قریبی رفیق محمد بخش صاحب بھی ہمراہ رہے۔ حصار کے مسلمانوں نے جس ایثار اور ہمدردی کا اظہار کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ جو بھی پروانہ شمعِ رسالتؐ کی ملاقات کو جاتے تو وہ اس کے قدموں میں آنکھوں کا فرش بچھاتے۔ اُن کی عقیدت واحترام کا رنگ ہی نرالا تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ کسی بلند پایہ قانون دان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس لئے جب میں دوسری بار حصار جانے لگا تو پہلے لاہور کی راہ لی۔ پروگرام تھا کہ مولانا ظفر علی خان سے مشورہ کیا جائے۔ ''زمیندار'' کے دفتر پہنچ کر مولانا ظفر علی خان کے فرزند اختر علی خاں اور خدا بخش اظہر سے تفصیلی بات

چیت ہوئی۔ اُن کی سفارشی چٹھی لے کر ہم حصار جا پہنچے اور ایڈووکیٹ جلال الدین قریشی سے ملاقات کی۔ قریشی صاحب کی پرانی رہائش گاہ چوبرجی (لاہور) تھی، لیکن ان دنوں ضلع کچہری حصار میں پریکٹس کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وکیلِ مذکور اور ان کے ایک بھائی، بدر الدین قریشی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور میں وکالت کرتے رہے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اپنے دوساتھیوں کے ہمراہ قریشی صاحب کی کوٹھی کے باہر باغیچے میں بیٹھا تھا۔ چند اور آدمی بھی اپنے اپنے کاموں کے سلسلے میں موجود تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا کہ اسی اثناء میں حصار کی تحصیل ''سرسا'' کے مولانا محمد اسماعیل صاحب تشریف لے آئے۔ مولوی صاحب بااثر اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ علاقہ بھر میں اُن کی عزت کی جاتی۔ قریشی صاحب ۱۹۳۶ء کے صوبائی الیکشن میں اقلیت کی نشست پر امیدوار تھے۔ انہیں مولانا موصوف کی ہمدردیوں اور تعاون کی ہر ممکن ضرورت تھی۔ اس واقعے کی کڑی یوں ہے، چونکہ ہم اجنبی تھے، اس لئے مولوی صاحب نے ایڈووکیٹ مذکور سے ہمارے متعلق دریافت کیا۔ قریشی صاحب موج میں تھے، لہٰذا ہمارا تعارف کرواتے ہوئے کہا:

''یہ اس جنونی نوجوان کے بدقسمت وارث ہیں جس نے ہندو ڈاکٹر رام گوپال کو قتل کیا۔''

مولوی صاحب کے سینے میں عشقِ رسول علیہ السلام کا چراغ فروزاں تھا۔ یہ جملہ سن کر برداشت نہ کر سکے اور غصے میں چائے کی پیالی دور پھینکتے ہوئے فرمایا:

''ارے کم عقل! اگر یہ بدقسمت ہیں تو پھر خوش قسمت کون ہے؟ کیا

تو بلند بخت ہے؟ نبی پاک ﷺ کی عصمت کے محافظ کو جنونی کہتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی؟ تیرے ساتھ تو کھانا پینا بھی جرم اور حرام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو مسلمان نہیں، مرتد ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ آئندہ کے لئے مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا"۔

دیکھنا مقصود ہوں، گر نیتوں کے آئینے
میری محفل میں ذرا تم اپنی آنکھیں بانٹنا

وکیل مذکور نے مولانا موصوف کو جانے نہیں دیا۔ وہ اظہارِ شرمندگی کے بعد ان سے معذرت کا خواستگار ہوا۔ مولوی صاحب نے اسے نصیحت فرمائی کہ عاشق رسول ﷺ کا ہمیشہ دل وجان سے احترام کرنا چاہیئے۔ بصورتِ دیگر سرکارِ مدینہ ﷺ خفا ہو جاتے ہیں۔ ان کا سایۂ رحمت سر سے اٹھ جائے تو انسان کڑی دھوپ میں جل کر رہ جاتا ہے۔

قریشی صاحب مرعوب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے منشی کو ہدایت کی کہ ان کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنا۔ مجھ سے جب اور جس وقت بھی ملنا چاہیں ملوا دیں۔ نیز انہیں استعمال کے لئے گاڑی بھی دے دیجئے۔ الغرض ہماری ہزار کوشش کے باوجود انہوں نے بلا فیس پیروی مقدمہ کی اور فائل کو بڑی محنت اور دلچسپی سے تیار کیا۔

☆☆☆

قبلہ غازی صاحب پہلے روز ہی ڈسٹرکٹ جیل حصار پہنچا دیئے گئے تھے۔ پوچھ گچھ کے لئے پولیس افسران بھی جیل میں ہی آتے رہے۔ جب تفتیش مکمل ہو چکی تو کیس، کورٹ میں بھیج دیا گیا۔ ابتدائی سماعت ایک ہندو مجسٹریٹ پنڈت لکشمی ڈت نے شروع کی۔ ماتحت عدالت میں آپ کی جانب سے جلال الدین قریشی، احمد زئی صاحب اور میاں منظور الدین ایڈووکیٹ پیروکار تھے۔ سول جج نے ایک دو پیشیوں کے بعد فرد جرم عائد کی اور مقدمے کی فائل سیشن کورٹ کے سپرد کر دی۔ سیشن جج ایک متعصب ہندو "کلونت رائے" نامی تھا۔ اس نے مذہبی عناد کی بناء پر ترتیب وار کیس کے خلاف جلد ہی سماعت کی تاریخ مقرر کر دی۔

جب سیشن کورٹ میں دو تاریخیں بھگتی جا چکی تھیں تو باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ گواہوں کی فہرست خاصی طویل تھی۔ دیگر چشم دید گواہوں کے علاوہ ایک وٹرنری کمپاؤنڈر شو ناتھ جبکہ دوسرا ہیڈ ماسٹر کا بھائی دینا ناتھ بیراگی تھا۔ شو ناتھ نے ایف آئی آر میں ابتدائی اندراج کے مطابق بتایا:

"میں ڈیوٹی ختم ہونے پر آرام کر رہا تھا کہ اتنے میں اللہ اکبر کی گرجدار

آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی مقتول کی خوفناک چیخیں بلند ہوئیں۔ ایک نوجوان حملہ آور اسے مسلسل للکار اور چاقو سے وار کر رہا تھا۔ چونکہ میں ذرا دور ایک درخت کے نیچے سستا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس طرف دوڑا۔ مجھے اپنی طرف بھاگتے دیکھ کر قاتل نے فرار ہونا چاہا۔ میں نے پکڑو! پکڑو!! کا شور مچا دیا۔ ملزم ایک تالاب کے درمیان میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے واویلے پر کافی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ازاں بعد پولیس آئی اور گرفتار کر کے جائے واردات کی طرف لے گئی۔ حملے کے وقت ملزم شدید غصے کے عالم میں کہہ رہا تھا ارے کم بخت آج میں اپنے رسول ﷺ کا بدلہ لینے آیا ہوں اور تجھے ہر گز زندہ نہ چھوڑوں گا"۔

دوسرے چشم دید گواہ دینا ناتھ بیراگی نے شودناتھ کے بیان کی تائید کی۔ اس کے بعد بیدہ رام گوپال کا بیان قلم بند کیا گیا۔ ڈاکٹر قبل ازیں ہی اپنے تاثرات لکھواتے ہوئے تعجب کا اظہار کر چکا تھا۔ اس نے عدالت میں اپنی طبی رپورٹ کے حوالے سے بیان کیا کہ چاقو کا پھل گو خاصا لمبا تھا اور تیز، مگر اس کے ایک ہی وار سے پیٹ کی اس قدر اندرونی شکستگی بے حد حیران کن ہے۔ نیز جسم سے خون نہ نکلنے کی توجیہہ دہشت کے اثر اور سکتے کے ناطے سے کی جا سکتی ہے، جب ڈاکٹر مذکور سے برآمد شدہ چاقو دکھا کر پوچھا گیا کہ اس سے اتنا کاری زخم آ سکتا ہے؟ تو اس نے کہا "ہاں ناممکن نہیں ہے اور اسی شدید ضرب سے موت واقع ہوئی"۔

آئندہ پیشی پر جرح آمدگی کے گواہان اور پولیس والوں کی شہادتیں ہوئیں۔

نقشہ نویس نے جائے موقع کے ماحول سے آگاہ کیا اور پارسل تیار کرنے والوں نے اپنی اپنی کارگزاری عدالت کے گوش گزار کی۔

جج کی جانبداری کا برملا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ گواہوں کی لغزشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سٹینو کو خلافِ واقعی عبارت لکھواتا۔ بہر حال غازی صاحب کے وکلاء نے صفائی کے گواہ طلب کرنے کی درخواست گزاری، جسے مسترد کر دیا گیا۔ دوسری درخواست آپ کے لواحقین نے داخل کروائی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ ہمیں لاہور سے ڈاکٹر محمد عالم کو بلانے کی اجازت دی جائے۔ اسے بھی قابل اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ان حالات میں وکیلوں کی کوششیں مطلقاً بے سود تھیں۔ انہوں نے عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے بائیکاٹ کی پالیسی اپنائی۔ اسکے ساتھ ہندو جج کلونت رائے کی طرف سے انہیں دھمکی دی گئی کہ تمہارے پریکٹس لائسنس منسوخ کر دیئے جائیں گے۔ ایڈووکیٹ جلال الدین قریشی اس بات سے گھبرا گئے۔ غازی صاحب نے انہیں تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ اس کا تمام ذمہ میں خود اٹھاؤں گا۔

جب غازی صاحب کی طرف سے کوئی بھی وکیل حاضرِ عدالت نہ ہوا تو جج مذکور نے آپ سے کہا "کیوں نہ سرکاری خراچ پر کوئی وکیل کھڑا کیا جائے۔ غازی صاحب نے فرمایا "مجھے حصار کے کسی مسلمان یا ہندو وکیل پر قطعاً بھروسہ نہیں ہے اور میری طرف سے پیش ہونے والے پہلے صاحب بھی اس زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔

الغرض رسمی کارروائی کی تکمیل کے لئے ایک ہندو ایڈووکیٹ بدھ رام کو سرکاری خرچ پر مقرر کیا گیا، جس نے گواہوں پر جرح مکمل کی۔ اس کے بعد جج

نے غازی صاحب سے دریافت کیا "کیا آپ نے راج گوپال کو قتل کیا؟ اور کیا بوقتِ گرفتاری چاقو، نوٹ بک اور ایک تسبیح آپ سے برآمد ہوئی تھی"؟ آپ نے فرمایا۔ "میں کوئی بیان دینے کو تیار نہیں۔ عدالت صریحاً جانب داری اور ذاتی دلچسپی ظاہر کر رہی ہے۔ نہ صرف میرا کیس ترتیب کے خلاف سماعت کیا گیا ہے بلکہ میرے لواحقین کو لاہور سے وکیل لانے کی اجازت بھی نہیں دی اور نہ ہی گواہانِ صفائی طلب کیے گئے ہیں۔ نیز میری طرف سے ناپسندیدہ وکیل منتخب کیا گیا۔ مجھے مناسب فیصلے کی توقع نہ ہے۔ اس لیے میں کوئی بھی بیان دینا نہیں چاہتا۔ تاہم اگر ہو سکا تو ایک اور بے غیرت کو ٹھکانے لگاؤں گا۔

غازی صاحب کا یہ بیان ٹائپ نہ کر دلیا گیا۔ برعکس اس کے فیصلہ یہ لکھا کہ ملزم کوئی بھی بیان لکھوانے سے انکاری ہے۔ فائل پر حتمی فیصلہ درج کرنے سے پہلے سیشن جج نے نائب کورٹ سے کہا کہ ملزم کے دستخط کرواؤ۔ غازی صاحب نے ٹائپ شدہ صفحات پڑھ کر پھینک دیئے اور فرمایا "میں اس وقت تک دستخط نہ کروں گا، جب تک میرے بیان کا پورا متن نہ لکھا گیا"۔ جج نے کہا آپ کو جو شکایت ہے علیحدہ کاغذ پر لکھ کر جمع کروا دیں"۔ آپ نے دوبارہ فرمایا "مجھے اس بددیانت عدالت پر قطعاً اعتبار نہیں، لہٰذا میں دستخط کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی کوئی درخواست دوں گا"۔ اس پر مجبوراً عدلیہ کو آپ کا بیان لکھنا پڑا اور دستخط کروائے۔ آئندہ پیشی پر فیصلہ صادر کیا گیا۔ عدالت نے نوٹ میں لکھا: "بیانات اور گواہوں پر جرح سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ملزم ہی حقیقی قاتل ہے۔ جرم مذہبی جنون کے باعث ہوا۔ استغاثہ حقائق پر مبنی ہے۔ اس لیے عدالت کے نزدیک مجرم سزائے موت کا مستحق ہے"۔

تھے آپ کے ستم ہی جو دورِ سکوت میں
ان پتھروں کو قوتِ گویائی دے گئے

فوجداری مقدمات کے برخلاف یہ مرافعہ بہت جلد نپٹا دیا گیا۔ ۷ر اگست ۱۹۳۶ء کو یہ واقعہ قتل پیش آیا اور اگلے سال کے آغاز میں سیشن کورٹ سے فیصلہ صادر ہو چکا تھا۔

کہتے ہیں جس روز حضرت غازی مرید حسینؒ کو سزائے موت سنائی گئی آپ بہت مسرور نظر آرہے تھے۔ جس قدر انھیں مسرت ہوئی، لواحقین بھی اتنے ہی رنجیدہ تھے۔ ایک کو سایۂ رحمت میں چھپ جانے کی خوشی، دوسروں کو جدائی کا بھیانک تصور۔ آپ جامِ شہادت نوش کرنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ رشتے دار اُن کو عرش سے فرش کی سمت کھینچنا چاہتے۔ آپ ہار مانتے تھے نہ وہ شکست! دونوں طرف ٹھن گئی۔ آئندہ اوراق میں یہی روداد قلمبند ہے۔

سیشن کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ لاہور میں اپیل دائر کی گئی۔ غازی صاحب کی طرف سے معروف قانون دان سلیم صاحب نے یہ موقف اختیار کیا کہ سیشن جج نے ملزم کو صفائی کا موقع نہیں دیا اور نہ ہی انہیں اپنی پسند کے ماہرِ قانون کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت ملی۔ ریکارڈ میں بھی اس امر کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ ماتحت عدالت نے جانب داری کا مظاہرہ کیا۔ اس لئے سیشن کورٹ میں اس مقدمے کی دوبارہ سماعت ہونی چاہیے۔ یہ اپیل میاں عبدالرشید صاحب (بعد میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے) اور ایک انگریز جج کولڈ سٹریم نے سماعت کی۔

۱۹۳۷ء کے ابتدائی مہینوں میں ہائی کورٹ میں پیشی ہوئی۔ ڈویژنل بنچ

نے مختلف تاریخوں کے بعد بحث و فیصلے کی تاریخ مقرر کی۔ اس روز سلیم صاحب نے بڑے وزنی دلائل پیش کیے۔ لیکن جج صاحبان کترا رہے تھے کہ اس صورت میں جب کوئی ملزم بیان نہیں دے گا تو مرافعہ دوبارہ سپردِ سیشن کرنا ایک باقاعدہ قانون بن جائے گا۔ ایڈووکیٹ مذکور نے جسٹس حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا:

"مائی لارڈ! اگر ملزم کی جگہ جناب کی ذات ہوتی تو کیا پھر بھی آپ اسے انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق گردانتے۔ اگر عدالت میرے موقف کو تسلیم نہیں کرتی تو مجھے حق پہنچتا ہے کہ یہ مقدمہ پریوی کونسل میں لے جاؤں"۔ اس پُر زور اور مدلل بحث کے سبب جسٹس میاں عبدالرشید صاحب مان گئے۔ اور فیصلے میں لکھا: "سیشن جج جگن ناتھ زد تشی کو مقرر کیا جاتا ہے کہ وہ یہ تمام کیس دوبارہ سماعت کریں"۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ جب چودھری خیر مہدی صاحب معاملہ طے کرنے کی غرض سے سلیم صاحب کے پاس پہنچے اور فیصلے کی نقل دکھائی تو انھوں نے مطالعے کے بعد بتایا کہ یہ کیس خاصا کمزور ہے اور سزا میں تخفیف کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ جب انہیں سیشن کورٹ میں وقوع پذیر ہونے والی پیچیدگیوں سے مطلع کیا گیا تو اُن کی رائے میں یہ غلط تھا۔ کیونکہ کوئی عدالت بھی اتنی متعصب، غیر سنجیدہ اور بے وقوف نہیں ہو سکتی۔ پختہ یقین دلائے جانے پر انہوں نے پیروی کی ہامی بھر لی۔ پیپر بک چھپنے پر انہوں نے غازی صاحب کے لواحقین کو بذریعہ خط بلوایا اور اپیل دائر کرنے پر انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس قانونی جدوجہد کے

عوض انہوں نے ۹۲۰ روپے فیس وصول کی۔ جو ان دنوں کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ در حقیقت سلیم صاحب اس رقم پر بھی رضامند نہ تھے۔ بقول ان کے میں نے ہندوؤں کی ناراضگی مول لے کر مقدمہ لڑنا ہے۔ اس لئے معاوضہ زیادہ ہونا چاہئے۔ برِ صغیر پاک و ہند کی معروف سیاسی شخصیت راجہ غضنفر علی خان بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے سلیم صاحب سے کہا "۱۵۰۰ روپے طلب کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ وہ بھی مسلمان ہے جس نے اپنی جان کی بازی لگائی اور آپ بھی مسلمان ہیں کہ مفت بات نہیں کر سکتے"۔ اس طرح ان کی مداخلت سے فیس کا مسئلہ حل ہو گیا۔

سنگ باری ہے یہاں شیشہ گری کی اجرت
کیسے اس شہر میں آئینہ بنائے کوئی!!

☆☆☆

سیشن جج جگن ناتھ زد تشی نے یہ کیس "حصار" میں سماعت کیا۔ تمام گواہوں کی شہادتیں دوبارہ قلمبند ہوئیں۔ لہذا مقدمے کی فائل جج مذکور کے زیرِ مطالعہ رہی۔ بالآخر ۲۰ جون ۱۹۲۷ء کو چشم دید گواہ طلب کر لئے گئے۔ حرمتِ مصطفیٰ ﷺ کے شیدائی کی جانب سے ڈاکٹر شیخ محمد عالم صاحب ایڈووکیٹ پیروکار تھے۔ ان کا آبائی تعلق بھلہ شریف کے نزدیکی گاؤں "کھوکھر زیر" سے تھا۔ سیاسی طور پر تا زندگی، کانگریس سے وابستہ رہے۔ اس مقدمے کی پیروی کے لئے ۲۵۰۰ روپے فیس وصول کی۔ یہ صاحب ۱۹ جون ۱۹۲۷ء کو لاہور سے حصار پہنچے اور اگلے روز عدالت میں پیش ہوئے۔ بحیثیت قانون دان انہوں نے آئینِ فوجداری سے وسیع واقفیت اور گہری دلچسپی کا ثبوت فراہم کیا۔ ٹھوس جرح کے سبب مبینہ چشم دید گواہ بیراگی نے ان کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا کہ جب شونا تھ نے رام گوپال کو چھرا مارا تو کیا تو نے دیکھا؟ اس نے کہا "ہاں"۔ گواہ سے دوبارہ پوچھا کہ واقعۂ قتل کے بعد تم نے ایک نوجوان جو ہتھکڑی پہنے ہوئے تھا کو نہیں دیکھا ہوگا۔ اس نے بتایا "جی نہیں دیکھا"۔ اسی طرح جب وہ الٹی سیدھی ہانکنے لگا تو جج نے مداخلت کرتے ہوئے

کہا "آپ نے اس پر جادو کر دیا ہے"۔ اور اپنے سٹینو کو ڈکٹیشن دی کہ یہ گواہ پاگل ہے یا پاگل بننا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹوکتے ہوئے کہا "سر! آپ یہ کیوں نہیں لکھواتے کہ گواہ جھوٹا ہے اور اس نے وقوعہ نہیں دیکھا"۔ لیکن عدالت نے اس موقف سے اتفاق نہ کیا اور مندرجہ بالا عبارت ٹائپ کروا دی۔

شیخ محمد سلیم صاحب ایڈووکیٹ نے سول سرجن کی شہادت پر جرح کرتے ہوئے کہا "پوسٹ مارٹم رپورٹ میں درج ہے کہ زخم اتنا گہرا اور سخت تھا کہ تمام آنتیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ اگر یہ درست ہے تو جسم سے خون جاری ہونا چاہئے تھا یا نہیں؟ ڈاکٹر نے جواب دیا کہ ان حالات میں خون کا نکلنا یقینی ہوتا ہے۔ آپ نے پوچھا "پھر یہاں خون نہ نکلنے کی کیا وجہ ہوئی؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا "خون ضرور نکلنا چاہئے تھا، تاہم میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ خون کیونکر برآمد نہیں ہوا؟ انہی ایام میں اخبارات میں ایک مضمون "زخم اور خون کا بہنا" چھپ چکا تھا۔ شیخ صاحب نے اس مضمون کو بھی عدالت میں بطور دلیل پیش کیا۔

آلہ قتل کے متعلق رپورٹ میں درج تھا کہ اس کے ساتھ آلائش قتل نہیں ہے۔ ایڈووکیٹ موصوف نے "سول ملٹری گزٹ" کا ایک پرچہ بطور ثبوت عدالت میں پیش کیا جس پر ایگزامینر ڈائریکٹر کا یہ فیصلہ کن بیان درج تھا کہ آلہ قتل چوبیس گھنٹے پانی میں رہنے کے بعد دھو بھی ڈالا جائے تو آلائش قتل نہیں جاتی۔ نیز ایک اور مصدقہ قانونی کتاب کے حوالے سے استغاثے کے بخیے ادھیڑ کر یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ شہادتیں بمطابق حالات جھوٹی ہیں۔

۲۰۔ ۲۱ جون ۱۹۲۷ء کے دو دن شہادتیں ہوتی رہیں۔ ۲۲ تاریخ کو

وقفہ تھا۔ ۲۲ر جون کو فریقین کے وکلاء کے مابین قانونی بحث ہونا قرار پائی۔

شیخ محمد عالم ایڈووکیٹ نے استغاثے میں قانونی سقم گنوانے کے بعد مندرجہ ذیل نکات پر بڑی جامع اور طویل بحث کی

☆۔ جائے وقوعہ پر خون کے نشانات نہیں پائے گئے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیان کردہ جگہ واردات مفروضہ ہے۔

☆۔ چونکہ طبّی رپورٹ کے مطابق جسم سے خون جاری نہیں ہوا، اس لیے پولیس نے فرضی پارسل تیار کیے ہیں۔

☆۔ ڈاکٹر کا بیان ہے کہ چاقو پر آلائش نہیں تھی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آلۂ قتل فرضی ہے اور پولیس نے برآمدگی کے سلسلے میں کماحقہٗ قانونی تقاضے پورے نہیں کیے بلکہ تھانے میں بیٹھے بٹھائے ہی خانہ پُری کر دی۔

☆۔ سول سرجن نے ایک ہی ضرب سے اس قدر گہرے گھاؤ کو تعجب خیز قرار دیا ہے۔

☆۔ خون کا نہ بہنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ راجپال حملہ آور کے وار سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

☆۔ اس چارپائی سے جس پر واقعۂ قتل پیش آیا، توڑ پھوڑ، ہاتھاپائی یا لہو کے داغ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

☆۔ عدالت میں گواہوں کی بدحواسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چشم دیدہ شاہد نہیں۔ سراسیمگی کی گھبراہٹ اور غلط سلط بیان، کیا اس کے جھوٹا ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟

☆۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص خوف کے مارے بھاگے جارہا

ہو اور جب پکڑا جائے تو کہے میں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ اپنے رسول ﷺ کا بدلہ لیا ہے، نیز خوشی کا اظہار کرے۔

☆۔ مقتول کی صحت، قاتل کی نسبت بدرجہا بہتر تھی۔ گواہوں کے بیان کے مطابق حملہ آور نے ڈاکٹر رام گوپال کو جگایا اور للکار کر وار کر دیا۔ کیا کوئی کمزور طاقتور کے آگے اس جرأت اور بے باکی کا اظہار کر سکتا ہے؟ ایسے تو چاہیے تھا کہ سوتے میں کام تمام کر دیتا۔

☆۔ ان حقائق سے انکشاف ہوتا ہے کہ استغاثہ کے بیانات حقیقت پر مبنی نہیں۔ مفروضہ قاتل کم سن اور کمزور نوجوان ہے۔ اس لئے فاضل جج صاحب کو ملزم کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھنا چاہیے۔۔۔۔ وغیرہ!

ایڈووکیٹ مذکور کے قانونی دلائل بہت وزنی ہونے کے باوجود مؤثر ثابت نہ ہو سکے۔ دراصل غازی صاحب کے اقراری بیان کے سامنے کوئی بھی نکتہ سنجی نہ چل سکی۔ آپ نے عدالت میں برملا اعتراف کیا کہ یہ میرے رسول ﷺ کا گستاخ اور واجب القتل تھا، سو میں نے اسے جذبہ ایمانی کے تحت جہنم رسید کر دیا۔ مردود کو واصل فی النار کرتے وقت میں بقائمی ہوش و حواس تھا اور اب بھی یہ بیان سوچ سمجھ کر دے رہا ہوں۔

آئندہ تاریخ پر فیصلہ سنایا جانا تھا۔ اس لئے اس روز غازی مرید حسین صاحب بھی کمرہ عدالت میں موجود تھے۔ آپ کے کافی دوست اور رشتہ دار بھی ملاقات کے لئے آئے اور مقامی آبادی کے ہزاروں مسلمان جن میں بہ تعداد کثیر نوجوان تھے، زیارت کے لئے مختلف جگہوں پر کھڑے رہے۔ روایت ہے غازی صاحب موصوف قدرے متفکر و مغموم تھے۔ مگر جب عدالت نے سزائے

موت کا فیصلہ بحال رکھا تو یہ پریشانی مسرت میں ڈھل گئی۔ قیاس ہے کہ آپ کو خدشہ تھا کہ شاید میری قربانی منظور نہ ہو اور شاید بری کر دیا جاؤں۔

سے پھانسی پانے کا فیصلہ آپ نے نہایت حوصلے اور سکون سے سنا۔ گویا یہ سولی پر لٹکنے کی خبر نہیں چشمہ حیواں پر پہنچنے کا پیغام ہو۔ ہزاروں افراد نے دیکھا کہ رسول عربی ﷺ کے عاشق صادق نے مدینہ منورہ کی طرف منہ کر کے جوشِ عقیدت سے سر جھکا لیا اور مترنم مگر بلند آواز سے عرض کیا۔ ”غلام حاضر ہے، یا رسول اللہ ﷺ“۔

سیشن کورٹ سے اب کے بھی سزائے موت کا حکم بحال رہا تھا۔ حضرت قبلہ غازی صاحبؒ کے لواحقین کو کب چین آتا تھا۔ انہوں نے فیصلے کی نقول حاصل کر کے ہائی کورٹ لاہور میں اپیل گزار دی۔ اس وقت ”سر جان ڈگلس ینگ“ چیف جسٹس تھا۔ جسٹس منرو نے اس کی معاونت کی۔ فیصلے کے دن بیرسٹر شیخ محمد سلیم نے ملزم کے حق میں قانونی نکات کی تشریح کرتے ہوئے بڑی اثر آفریں تقریر کی۔ ان کے معاون بیرسٹر محمد علی اور ڈاکٹر محمد عالم تھے۔ انہوں نے چیف جسٹس کو ایک حد تک اپنا ہم خیال بنا لیا۔ اس نے مشورے کی غرض سے جسٹس منرو کو متوجہ کیا جو اس وقت ملزم کا اقبالی بیان پڑھ رہا تھا۔ اس نے مسل چیف جسٹس کے آگے بڑھا دی۔ جس نے مطالعہ کر کے خفا ہوتے ہوئے فائل کو نیچے پھینک دیا اور سلیم صاحب کو ڈانٹ کر کہا: ”تم دھوکا کر رہے ہو، جب کہ تمہارا موکل اقراری ہے“۔ اور اپیل مسترد کر دی۔

ہائی کورٹ سے اپیل خارج ہونے کی اطلاع ”حصار“ میں ساقی کوثر ﷺ کے متوالے تک پہنچی تو وہ بہت شادکام ہوئے۔ دوسری طرف آپ

کے عزیز و اقارب اس بھاگ دوڑ میں تھے کہ ریت کی کوئی صورت نکل آئے۔ انھوں نے بے چینی کے عالم میں رحم کی اپیل بنام گورنر اور دماغی معائنے کے لئے ہوم سیکرٹری کی خدمت میں درخواستیں گزاریں۔ سر سکندر حیات خان، وزیر اعلیٰ تھے اور گورنر ایک انگریز۔ حافظ عبدالحلیم صاحب، جو کمانڈر انچیف کے پرائیویٹ سیکرٹری اور خان بہادر کے خطاب یافتہ تھے کو شمع رسالت کے اس پروانے سے خاص انس تھا۔ ان کی جائے مولد "جھوریاں" تھی لیکن بسلسلہ ملازمت دہلی نقل مکانی کر گئے اور تقسیم ہند کے بعد بھی وہیں مقیم رہے۔ آدم بردے موضوع وہ مقدمے کی صورت حال سے باخبر تھے۔ رحم کی اپیل اور دماغی معائنے کے لئے درخواست کی اطلاع بھی انہیں مل چکی تھی۔ انہوں نے شملہ سے خیر مہدی صاحب کے نام اس امر کا ایک خط لکھا کہ آپ فی الفور یہاں آکر مجھ سے ملاقات کریں۔

چودھری خیر مہدی نے حسب ہدایت شملے کا سفر کیا۔ ہوم سیکرٹری، برطانوی نژاد تھا۔ حافظ خان بہادر صاحب کے ایک دوست نے اطلاع کر دی کہ اس کے اللہ بخش ٹوانہ اور خضر حیات خاں ٹوانہ کے ساتھ دوستانہ مراسم ہیں۔ اس نے ٹیلیفون پر مزید بتایا۔ ٹوانے جنگل میں سور کی مثل ہیں، جن سے بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ المختصر ہوم سیکرٹری کے لئے موزوں سفارش ڈھونڈ لی گئی۔ اس نے بتایا "گو ایسے تمام امور میرے ذمے ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے گورنر صاحب نے یہ کیس خاص طور پر لکھوایا ہوا ہے۔ ایسے سر چھوٹو رام نے کہہ رکھا تھا کہ اس مقدمے میں ملزم کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ البتہ آپ کی خواہش پر ڈاکٹری رپورٹ مانگ لیتا ہوں"۔

غازی مرید حسین صاحبؒ کے دماغی معائنے میں یہ مصلحت پنہاں تھی کہ کسی طرح مینٹل ہسپتال کے ڈاکٹر سے آپ کے متعلق یہ سرٹیفکیٹ حاصل کیا جائے کہ ان کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ اس بناء پر نہ صرف پریوی کونسل میں اپیل کی اہمیت دوچند ہو جاتی بلکہ گورنر بھی رحم کی اپیل منظور کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

پھر انہی انگڑائیوں میں حشر کے سامان ہوں

بزمِ جاناں میں کوئی آشفتہ سر بھی چاہیے

بناء بریں اس بارے میں بھی کوششیں شروع ہو چکی تھیں کہ اگر بچاؤ کی کوئی گنجائش پیدا نہ ہو تو آپ کو کسی قریبی جیل یعنی کیمبل پور، میانوالی، یا جہلم میں پھانسی دیا جائے۔

۲ر ستمبر ۱۹۳۷ء کو چودھری موصوف نے شملے سے حصار کا سفر اختیار کیا اور ۴ر ستمبر کو فدیۂ حبیبِ کبریا ﷺ سے ملاقی ہوئے۔ اس روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اسے کوئی کرامت کہے یا دلچسپ حکایت! بعض ان کو کشف سمجھیں گے اور کچھ خرقِ عادت روایت! بہر حال کوئی بھی خیال کیا جائے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مردانِ صفا کے سامنے پوری کائنات ہتھیلی کی طرح کھلی ہے اور شرق تا غرب کی تمام وسعت، ان کے ایک گام میں محیط ہے۔ سندانِ عشق سے مضروب نہ صرف چہرے بلکہ دلوں کا حال بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔

ملاقات کے لئے جونہی چودھری صاحب سامنے پہنچے تو غازی حضور نے پوچھا: "آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" بتایا گیا: "یہ درخواست دی ہے کہ سزا پر عملدرآمد کسی نزدیکی جیل میں ہو"۔ آپ نے فرمایا: "اس بارے میں پریشان

ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے بتادیا ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی مشکل تھا کہ جیل تبدیل نہ ہوسکتی"۔

"آپ کے پاس کیا حل ہے؟" اس سوال پر شہید ناز نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "وہی جو بہانہ آپ بنا رہے ہیں۔ میں کسی کے سر میں زخم لگا دیتا تو انہیں مجھے پاگل سمجھ کر کہیں اور شفٹ کرنا پڑتا۔ میرے جیسے خوش نصیب کو خواہ مخواہ پاگل بناتے ہوئے تمہیں حیا نہیں آتی۔ خاموشی سے گھر چلے جاؤ جلد ہی مجھے کسی نزدیکی جگہ بھیج دیا جائے گا"۔

غازی صاحب" کو یہ کس نے بتادیا کہ مینٹل ہسپتال میں آپ کے دماغی معائنے کے لئے درخواست دی جاچکی ہے۔ حالانکہ طے پایا تھا "آپ کو اس معاملے سے مطلع نہ کیا جائے مبادا، آپ ناراض ہوں"۔

اس موضوع پر سوچا اور سمجھا تو جاسکتا ہے لیکن بیان مناسب نہیں۔ آقا ﷺ نے ہی تنہائیوں میں اپنے غلام کی دستگیری فرمائی۔ یہ سہارا نہ ہوتا تو قید کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بہاروں کا گزر کیسے ہوسکتا تھا۔

جن پر نہ سائے زلفِ غزالاں کے پڑ سکے
احساس کی نگاہ میں ویرانے بن گئے

ایک طرف سپرنٹنڈنٹ جیل حصار نے یہ خیال ظاہر کیا "ان کو کسی اور جگہ پھانسی دینے کا کوئی امکان نہیں"۔ جب کہ دوسری جانب آپ کا ارشاد تھا "مجھے یہاں پر پھانسی نہیں دیا جاسکتا"۔

غازی صاحب کے لواحقین کہ یہ کوششیں بارآور نہ ہوئیں جو آپ کو

کسی نزدیکی جیل میں منتقل کرنے سے متعلق تھیں۔ تمام لوگ اس بات سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے تھے۔ مگر یکایک جانے کیوں حکومت نے آپ کو جہلم بھیجنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ جہلم شہر میں آپ کو شاندار جلوس کے ذریعے لایا گیا اور پھر سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

۹ ستمبر کی رات غازی محبت، ڈسٹرکٹ جیل جہلم میں تشریف فرما تھے۔ اس کی اطلاع دس تاریخ کو بھلہ شریف پہنچی اور دوسرے دن ملاقات کا بندوبست ہوا۔

جہلم کی ضلعی جیل سے غازی ممدوح کو بغرض معائنہ پولیس کی زیرِ نگرانی مینٹل ہسپتال لاہور لے جایا گیا۔ ایک انگریز ڈاکٹر یہاں کا انچارج تھا۔ جس کی ڈاکٹر حق نواز صاحب آف چکوال سے بے تکلفانہ دوستی تھی۔ فدا کارِ رسالت ﷺ کے رشتے دار اُن کو بھی برائے سفارش لاہور لے گئے۔

دماغی امراض کے اس ڈاکٹر نے لیبارٹری میں جب نفسیاتی ٹیسٹ لینا شروع کیا تو آپ انتہائی باوقار لہجے میں اُن سے یوں مخاطب ہوئے:

"میں نہ صرف زیورِ تعلیم سے آراستہ بلکہ صاحبِ نصاب بھی ہوں۔ لوگ میرے دماغ کے بارے میں بے جا شک کرتے ہیں حالانکہ میں ہی عقلمند ہوں جس نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور پروگرام کے ساتھ گستاخِ مصطفیٰ کو ٹھکانے لگایا۔ یہ اس قدر منافع بخش سودا ہے جس کا کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا۔ مجھے نفع و نقصان کی خوب سوجھ بوجھ ہے۔ بے وقوف تو یہ خود ہیں جو میرے اور پاگلوں میں فرق روا نہیں رکھتے۔ میں بھلا خود کو بے وقوف و نادان کیسے کہہ لوں۔ اس

نعمتِ کبریٰ کی ناشکری میرے تصور سے بھی باہر ہے"۔

یہ مچلتی ہوئی شوخ ادائیں ہیں فریب
اہلِ دل ہوش کرو، چاک گریباں نہ کرو

ڈاکٹر مذکور نے اپنی رپورٹ کے آخر میں لکھا "مجھے تعجب ہے اس باشعور اور منجھے ہوئے نوجوان کے دماغی معائنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی"۔

جب الحاج خیر مہدی صاحب کو مذکورہ بالا بیان کی خبر ملی تو وہ غصے سے بھرے ہوئے آئے اور زبان سے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ آپ نے فرمایا:

"میں تمہاری ایسی باتوں میں آکر اپنی عاقبت خراب نہیں کر سکتا۔ آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ طیبہ کی نسیمِ جاں فزا، ہر روز پیغام لاتی ہے۔ خدارا مجھے جلد بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں پہنچنے دیجئے"۔

مجلسِ احرار جہلم کے ضلعی ناظم مسٹر لطیف صاحب ایک درد مند انسان اور متحرک نوجوان تھے۔ غازی مرید حسین شہید سے انہیں بے پایاں عقیدت تھی۔ چودھری خیر مہدی صاحب بتاتے ہیں "انہوں نے ہمارے ساتھ ہر قسم کا بڑھ چڑھ کر تعاون کیا۔ مینٹل ہسپتال سے حسبِ خواہش سرٹیفیکیٹ مل جانے کا ہلکا سا امکان تھا۔ مگر یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔ اب ہمیں پریوی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹانے کی سوجھ رہی تھی۔ میں اور لطیف احراری، نوابزادہ سعید اللہ خان صاحب ہوتی جوان دنوں ڈپٹی کمشنر جہلم تھے، کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ پریوی کونسل میں اپیل گزارنے کے لئے ان کی اجازت قانوناً لازم تھی۔ وہ ہمیں بڑے تپاک سے ملے اور آمد کا سبب دریافت کیا۔ ہمارے بتانے پر انہوں نے

جواب دیا کہ میں ایک بار، پیکرِ غیرت و مجسمۂ وفا سے مل لوں۔ دوسرے روز انہوں نے بتایا کہ میں دورے کے بہانے جیل میں گیا۔ غازی صاحب کے محویتِ شوق کا یہ عالم رقت انگیز ہے۔ آپ لمحۂ وصال کے انتظار میں پل پل گن کر گزار رہے ہیں۔ ان کا حکم ہے میری طرف سے اپیل نہ کی جائے۔ اگر آپ لوگ نہ مانے تو میں بھی اس پر دستخط کرنے والا نہیں۔ جلوۂ زیبا کا پروانہ، آنکھوں میں خمارِ شوق لئے گنبدِ خضراء سے لپٹ جانے کو بے قرار ہے۔ ہم انہیں کیونکر روکیں؟ ان کے جذبۂ اخلاص کی سرمستیاں کوثر کی شراب میں ڈھل کر چھلکنا چاہتی ہیں۔ اس لئے اب میخانۂ شوق کا دروازہ کھل ہی جانے دیجئے۔ ہر چند ہماری کوشش رہی کہ جلوۂ اقدس کا محرم کسی طرح مان جائے مگر ان کے سینے میں عشق کی سلگتی ہوئی چنگاری نے ہمیں جانگسل ضبط سکھادیا۔ نتیجہ ہم پریوی کونسل میں اپیل دائر نہ کر سکے۔ اب آپ کی شہادت یقینی تھی اور ہجومِ محبت، ان کے روئے تاباں کی آخری زیارت کے لئے دل گرفتہ تھا۔

شمعِ رسالت کا جانثار، جہلم کے قید خانے میں منتقل ہو چکا تھا۔ ۱۱/ستمبر ۱۹۲۷ء کو ان کے جملہ رشتے دار ملنے کے لئے یہاں آئے۔ ان کے بعد ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ آپ کے لواحقین نے عارضی طور پر رہائش کا بندوبست بھی وہیں کر لیا۔ ایک ملاقات میں والدۂ غازی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا "مجھے غم یہ ہے کہ میرے اکلوتے بیٹے کے گلے میں رسہ ڈالا جائے گا۔ آہ! گھر میں کس کے دم سے رونق ہو گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا صرف ایک بیٹا تھا اور وہ بھی جلد ہی جدا ہونے والا ہے۔"

غازی صاحبؒ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے عرض کیا "اماں حضور!

اگر بیٹا ایک ہو تو زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ نا۔ اور سب سے پیاری شے ہی اللہ کی راہ میں قربان کرنی چاہیے۔ اس لئے آپ تو اور بھی خوش ہوں کہ دینِ اسلام اور حرمتِ رسول ﷺ پر اپنے اکلوتے اور پیارے بیٹے کو فدا کر رہی ہو۔ بھلا، آپ سے بڑھ کر اور کون خوش قسمت ہوگا"۔

ظلمتیں دور ہوئیں، صبح ہوئی دن نکلا!

سایہ زلفوں کا تیرے رخ سے ہٹا ہو جیسے

ایک اور ملاقات میں جب غازی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کی قبر کہاں بنائی جائے؟ تو آپ نے فرمایا:

"میری لاش میرے شیخ کریم کے آستانہ عالیہ پر پھینک دیں اور یہ عرض کریں کہ میخانے کی مٹی میخانے میں ہی رہے تو اچھی لگتی ہے۔ اس لئے میری میت کو بھی اسی فضا میں دفن کیا جائے"۔

جب حضرت قلندر کریم نے درد کی نے میں یہ کہانی سنی تو بے قراری سے فرمانے لگے "مرید حسین نے مجھے بے دام خرید لیا ہے۔ ان کے جسدِ اقدس کو آبائی گاؤں میں ہی سپردِ خاک کیا جائے گا۔ جب تک "بھلہ" سے چاچڑ شریف کا نقشہ نہ بن جائے، میں اس سرزمین سے نہیں اٹھوں گا"۔

جوں جوں آپ کی شہادت کا وقت قریب آ رہا تھا، ملاقاتیوں کے ٹھٹھ لگ رہے تھے۔ لاتعداد لوگوں نے زیارت کی اور دلوں کو نورِ ایمان سے بھر لیا۔ آپ کے سامنے آتے ہی ملنے والوں کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔ سینے میں سانس رکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ غازی صاحب کا صبر و استقلال مثالی تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ آپ شہادت کے لئے مضطرب تھے اور ہر شب دعا کرتے کہ طلوعِ سحر سے

پہلے ہی خواجۂ بطحا علیہ وسلم کی چوکھٹ تک رسائی ہو۔ کیوں نہیں، آپ اس قافلے کے سرخیل ہیں جنہیں کوچۂ حبیب علیہ وسلم سے اٹھ کر سوئے جنت جانا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ مقام بلند بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

حضرت قبلہ قلندر کریم، سیاہ کپڑوں کو پسند نہیں رکھتے تھے۔ مرید بھلہ بھی اس سے خاص طور پر گریزاں رہتے۔ آپ نے لحۂ وصال سے دو دن قبل سپرنٹنڈنٹ جیل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”مجھے پھانسی کے وقت سیاہ لباس نہ پہنایا جائے“۔ اس نے کہا کہ میں مجبور ہوں اور یہ روایت بدلنے کی از خود جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ نے اسے واضح اور بالکل صاف الفاظ میں بتادیا کہ چاہے مجھے گولی مار دینا، میں کالے رنگ کا کپڑا زیب تن نہیں کروں گا۔

سپرنٹنڈنٹ مذکور نے بذریعہ فون لاہور میں آئی جی جیل خانہ جات سے رابطہ کیا اور تمام صورتِ حال گوش گزار کی۔ جیل انتظامیہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر غازی صاحب کی خواہش کا احترام نہ کیا گیا تو نہ صرف جہلم شہر کے مسلمان بلکہ مضافاتی قصبوں اور ارد گرد کے دیہات میں بسنے والے کلمہ گو مر مٹنے پر تیار ہو جائیں گے۔ جب یہ بات گورنر کے نوٹس میں لائی گئی تو جواب ملا: ”قیدی کے لواحقین کو ہدایت کریں کہ وہ اپنے عزیز کی رائے معلوم کر کے اسی طرز کا پسندیدہ لباس بنوالیں“۔ یوں شہید وفا کی خواہش کے پیشِ نظر تمام کپڑے سفید تیار کروائے گئے۔ یہ ٹوپی، کرتے اور پاجامے پر مشتمل تھے۔

کل ان کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گماں تک نہ ہوا، وہ بچھڑنے والا ہے

محبت کے باب میں ایک اور شہید کا اضافہ ہونے والا تھا۔ وفا کی شاخ پہ

حسین رنگ گلاب کھلنے میں بس تھوڑی دیر باقی تھی۔ جب حکومت کی طرف سے غازی مرید حسینؒ کے بلیک وارنٹ جاری ہوئے تو گویا کالی گھٹاؤں کا موسم اُمڈ آیا۔ کا کل درخ کا اسیر قید خانہ دنیا سے رہا ہونے والا ہے۔ یہ خبر اس قدر مسرت بخش تھی کہ روز بروز عندلیبِ طیبہ کی رنگت نکھرتی چلی گئی۔ آپ کا چہرہ اتنا پُر رونق اور ہشاش بشاش نظر آتا جیسے کسی نے چاندنی کا غازہ مل دیا ہو۔ آپ کی خمار آمیز آنکھوں میں ایک میخانہ تیر تا رہتا۔

ڈسٹرکٹ جیل جہلم میں بادہ عرب کے مشتاق کا عرصۂ قیام ۱۰ر ستمبر کی مخمور شام سے شروع ہوا تھا۔ اور ۲۴ر ستمبر کی سہانی صبح سمٹ گیا۔ اس دوران کئی ایمان پرور واقعات رونما ہوئے۔ کہتے ہیں جو شخص بھی زیارت کی غرض سے آپ کے سامنے آتا، دم بخود ہو کر یوں جھومنے لگتا جیسے بادۂ آتشیں چڑھا رکھی ہو۔

حضرت غازی مرید حسین سے آخری ملاقات کا حال بھی عجیب ہے۔ ۲۳ر ستمبر ۱۹۳۷ء کو تمام دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ ملاقاتیوں کو تین گروپوں میں بانٹ دیا گیا۔ پہلے دستے میں اہلِ خانہ واقارب شامل تھے۔ دوسرا دستہ آپ کے بے تکلف دوستوں اور قریبی احباب سے مترتب ہوا۔ جبکہ تیسری ٹولی میں شکل آشنا لوگ اور آپ کے سینکڑوں اجنبی عقیدت مند شریک تھے۔

اس روز پولیس کی کڑی نگرانی تھی۔ پورے شہر کے اہم چوراہوں اور قابلِ ذکر سڑکوں پر پہرے کا سخت انتظام تھا۔ جابجا اسلحے سے لیس فوجی بھی نظر آئے۔ دو تین چوکوں میں حفظِ ماتقدم کے تحت توپیں بھی گاڑی گئیں۔ ایک اعلیٰ افسر نے انتظامات کا معائنہ کیا۔ جیل حکام کو مزید ہدایات دیں۔ بناء بریں دیگر کئی گورے افسر اپنی گاڑیوں پر مختلف جگہوں کے چکر لگاتے رہے۔ اہلِ شہر کو معلوم

ہو چکا تھا کہ حضرت قبلہ غازی صاحبؒ کو پھانسی دی جانے والی ہے۔ اس لئے مسلم معززین نے اپنے طور پر جنازے کے پروگرام کو حتمی شکل دی۔ مساجد میں اعلان کروائے گئے کہ کل غازی صاحب، شہید کئے جانے والے ہیں۔ تمام مسلمان جوق در جوق جنازے میں شامل ہوں۔ اور شہید ناز کی آخری زیارت کریں۔ تانگوں اور ویگنوں پر لاؤڈ سپیکر نصب کر کے یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ ناموسِ رسالت کا محافظ آج رات کسی وقت دار کی زینت بنا دیا جائے گا۔ پیروکارانِ توحید سے اپیل کی جاتی ہے کہ جنازے میں شامل ہو کر اپنے دلوں کو ایمان کی دولت سے مالا مال کریں۔

ادھر دل گرفتگی کا یہ سامان مہیا ہو رہا تھا۔ ادھر شکیب و قرار کے باب کا ایک نیا ورق سامنے آیا۔ حضرت غازی مرید حسینؒ سے آخری ملاقات کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ پہلا وفد جب آپ کے سامنے پہنچا تو غازی صاحب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ قرطاسِ جبیں کی شکنیں عجب منظر پیش کر رہی تھیں۔ ان خراشوں کو ترتیب دے کر پڑھا گیا تو مژدۂ جانفزا کی جھلک نظر آئی۔ لوحِ دل پر مرقوم، نامِ مبارک کا عکس صفحۂ رُخ پر اتر آنا گویا تفسیرِ محبت کی تمہید ہے۔

جب بھی آتا ہے شبِ غم میں مجھے تیرا خیال
دل کے آنگن میں اجالا سا بکھر جاتا ہے

آپ کی والدۂ محترمہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ جدائی کے جان لیوا تصور سے لرز گئیں۔ رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے۔ اشکوں کا سیلاب تھم نہ سکا تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ ممتا کی دل دہلا دینے والی صدائے بازگشت سے کربناک

کیفیت پیدا ہو گئی۔ والدہ حضور کو زار و قطار روتے دیکھ کر آپ نے عرض کیا:

"ماں! میں چاہتا تو عدالت سے بچ سکتا تھا مگر یہ راستہ تو میں نے خود اختیار کیا ہے۔ جس وجہ سے آپ پریشان ہو رہی ہیں، میں تو یہاں تک بڑی مشکلوں سے پہنچا ہوں۔ خدا کے لئے مت روئیے۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ مجھے مسکراتے ہوئے چھوڑ جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب بارگاہِ نبی علیہ السلام میں پہنچوں تو میرے لباس پر آنسوؤں کا کوئی نشان نہ ہو۔ آپ کے ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی سی لکیر سے میرے شوق کا قافلہ جھوم اٹھے گا۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ کو بیٹے کی قربانی کے سبب سیدہ خاتونِ جنتؓ کے قدموں میں جگہ مل جائے گی"۔

اس کے بعد آپ کی رفیقۂ حیات سامنے آئیں۔ روتے روتے ان کا برا حال ہو چکا تھا۔ آپ نے فرمایا: "مجھ سے کوئی غلطی یا زیادتی ہوئی ہو تو خدارا، معاف کر دینا"۔ اس سے آگے کوئی بات نہ ہوئی۔ بس ایک دوسرے کو دیکھا گیا۔ اب کے پلکوں پر شبنم کے قطرے نہیں ہونٹوں پر تبسم کے شرارے رقص کر رہے تھے۔ یہ خاموشی بھی ایک طرزِ گفتگو تھی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ قوموں کے بگاڑ اور بناؤ میں سب سے اہم کردار عورتیں ادا کرتی ہیں۔ غازی صاحب کی شریکۂ زندگی، محترمہ امیر بانو صاحبہ نے اپنے محبوب شوہر کی آغوشِ محبت، حرمتِ رسول علیہ السلام پر نثار کر دی اور اس جذبۂ وفا نے انہیں حوروں کی محبوبہ بنا دیا۔ آج ایسی بیویوں کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ رام گوپال گاہ گاہ دکھائی دیتے ہیں مگر کسی سینے میں مرید حسین کا

دل نہیں دھڑک رہا۔ حالانکہ راجپال کا آوازہ قلم توڑنے کے لئے کسی نہ کسی پاکیزہ جوانی کو تختۂ دار کی زینت بننا ہی پڑتا ہے۔

چوہدری خیر مہدی صاحب کو آپ نے وصیت فرمائی:

"میں نے ایک قطعہ اراضی خانہ خدا کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس کو جوں کا توں رہنے دینا۔ بقیہ زمین اس لئے مصرف میں نہیں لایا کہ آپ مجھے رشتہ قرابت توڑنے والا نہ کہیں۔ کبھی لالچ میں نہ پڑ جانا، یہ اشیاء ضرورتِ زندگی تو ہیں، زندگی نہیں ہیں۔ اسلامی اصولوں کو ہمیشہ حرزِ جان بنائے رکھنا۔ خدا نخواستہ، اگر آئندہ کوئی اور بد طینت، مقامِ مصطفی علیہ السلام کی طرف ترچھی نگاہ اٹھائے تو اس راہ میں تمام نقدِ حیات لٹا دینا۔ میں ایک حقیر بندہ ہوں جو کوئی خوبی نہیں رکھتا۔ تاہم کلمہ گو، عشقِ رسالت علیہ السلام کے حوالے سے مری تربت پر آتے رہیں گے۔ ان کی ہر ممکن خدمت کرنا۔ میرے مقبرے کے نزدیک تمباکو نوشی نہ کی جائے۔ وضو کے لئے معقول انتظام ہونا چاہئے۔ زائرین کو کہہ دیں کہ یہاں فاتحہ خوانی کی ضرورت نہیں ہے۔ احاطۂ قبر میں جتنی دیر ٹھہریں فقط درود و سلام کا ورد کرتے رہیں۔ میں اپنی ذات کے لئے سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتا۔ زندگی کے ایام اس اسم مبارک علیہ السلام کے وظیفے میں گزرے ہیں۔ بعد از موت بھی یہی رنگ چاہتا ہوں۔ میری والدہ صاحبہ کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھنا۔ اور بندہ کی اہلیہ کو بھی کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔"

ملاقات کی غرض سے آنے والے احباب کو آپ نے یادوں کی بہاریں

اور الفاظ کے موتی عطا کیے۔ اجنبی اشخاص کو بھی آپ بڑے تپاک سے ملے۔ اور پندو نصائح فرماتے رہے۔ اس سخن دلپذیر کی صرف اس قدر تفصیل موجود ہے، جو نگاہیں آپ کا نورانی چہرہ دیکھ آئیں، اہل دل وہ آنکھیں چوم لینا بھی عبادت سمجھتے ہیں۔

بہر حال آخری ملاقات کا یہ سلسلہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۳۷ء کو صبح ۸ بجے شروع ہوا اور ۴ بجے شام ختم ہو گیا۔ غازی صاحبؒ نے اپنے ہاتھ سے جائیداد کے متعلق ایک وصیت لکھی۔ شام کے بعد چند اعلیٰ مسلمان حکام نے جیل کے معائنے کا بہانہ بنا کر آپ سے ملاقات کی اور اپنی ویران آنکھوں مین جلوے سمیٹ لئے۔ آئندہ اوراق میں ایک رات کے مسافر کی اسی نظر افروز اور دل نواز آپ بیتی کا تذکرہ مقصود ہے۔

غازی صاحب کے قریبی احباب، رشتے دار، اساتذہ اور بچپن کے ساتھی اپنی یادوں کے دریچے وا کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ، جب آپ نے سن شعور مین قدم رکھا تو اس کے بعد شاید ہی کبھی نماز قضا کی ہو۔ قرآن مجید کی تلاوت ان کا معمول تھا۔ مسجد سے ان کا تعلق ہمیشہ ماہی و آب کا سا رہا۔ رسولِ مقبول ﷺ سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ ذکرِ حبیبؐ ہو یا مدینۃ النبیؐ کا تذکرہ، وہ اکثر آبدیدہ ہو جاتے۔ رات کو سونے سے پہلے درودِ پاک کا ورد ضرور فرماتے۔ معلوم ہوتا جیسے خداوند تعالیٰ نے آپ کو کسی عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ گرفتاری کے بعد تو اس جذبے میں اور بھی شدت آ گئی۔ کہتے ہیں سیشن کورٹ میں آپ کی ابتدائی پیشیاں تھیں۔ ایک روز لنچ کا وقفہ ختم ہونے پر عدالت میں طلبی ہوئی۔ مقدمے کی کارروائی جاری تھی۔ اتنے میں ظہر کا وقت ہو گیا۔ آپ نے سیشن جج کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”مجھے نماز پڑھنا ہے، میرے لئے وضو کے لئے پانی اور مصلے کا بندوبست کروا دیجئے“۔ جج چونکہ ہندو تھا، وہ غصے سے لال پیلا ہو کر بولا: ”نوجوان! یہ کورٹ ہے، مسجد نہیں۔ ویسے بھی تمہیں اپنی ملزم کی حیثیت بھول نہیں جانا چاہئے“۔ آپ بھی تلخ کلامی پر اتر آئے۔ فرمایا: ”میں سب سے بڑی عدالت کی بات کر رہا ہوں اور تم دنیاوی وفاقی کچہری کی بات لے بیٹھے ہو۔ انتظام کرواتے ہو یا میں خود کوئی قدم اٹھاؤں“۔ اس پر وہ سہم گیا اور اپنے سٹینو کو اشارہ کیا۔ وہ نہایت مخلص اور صاحبِ درد مسلمان تھا۔ پھر لوگوں نے آپ کو کمرۂ عدالت میں خدا کے حضور سر بسجود ہوتے دیکھا۔ ازاں بعد دورانِ سماعت جب بھی اذان سنائی دی، آپ کو نماز کے لئے وقت دیا جاتا۔

قبل ازیں بتایا جاچکا ہے کہ اس شاہین صفت نوجوان کو جانے کیوں حصار سے جہلم منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہ سرورِ کونین ﷺ کے غلامِ صادق کی ایک انوکھی اور دلچسپ کرامت ہے۔ مگر اس کا ظاہری سبب کیا تھا؟ کہتے ہیں حصار جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے حکامِ بالا کو اس امر کی رپورٹ دی تھی کہ اگر قیدی مذکور کو چند دن اور یہاں رہنے دیا گیا تو مجھے بجا طور پر ڈر ہے کہ جیل کے تمام غیر مسلم آپ سے متاثر ہو کر مذہبِ اسلام قبول کر لیں گے۔ آپ رات ڈھلے پُر درد لَے میں نعتیں گنگناتے، خوش الحانی کے اثر اور کلام کی تاثیر سے سننے والوں کی نیندیں اڑ جاتیں، آہِ سحر گاہی جب قرأت میں ڈھل جاتی تو لوگ اپنے کلیجے تھام لیتے۔

ہنوز قصۂ شوق ناتمام ہے۔ مختلف روایتوں کے باہمی ربط سے ایک بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ لواحقین کی طرف سے آپ پر عدالت میں اقبالی بیان نہ دینے کی خاطر ہر طرح سے دباؤ ڈالا گیا۔ مقامی جامع

مسجد کے خطیب وامام نے بھی آپ سے ملاقات کی اور قائل کرنا چاہا۔ کشمیری گیٹ دہلی کے ایک مولوی صاحب، جن کا آبائی تعلق کوہاٹ سے تھا اور شیر دل مجاہد کی دہلی میں چند روزہ رہائش کے دوران متعارف ہو چکے تھے۔ انہوں نے بھی آپ کو انکارِ فعل کی ترغیب دی۔ مگر آپ نہ مانے۔ مولانا موصوف بہت شرمندہ ہوئے، وہ اکثر کہا کرتے "میں بہک گیا تھا، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور غازی صاحب راضی ہوں"۔

میں نے ہر طور نکھاریں تیری یادیں لیکن
پھر بھی چہرے پہ اداسی کے نشاں ملتے ہیں

جب مولاناؤں کا فلسفہ اثر نہ کر سکا تو غمزدہ قرابت داروں کو ایک اور تجویز سوجھی۔ درحقیقت غازی صاحب کی طرف سے اشارہ ملا تھا اگر حضرت قبلہ قلندر کریمؒ فرمادیں تو غور کیا جا سکتا ہے۔ پیر صاحب کو حصار کی جیل میں لے جایا گیا۔ مرید، کنجِ اسارت کی سلاخوں کے اندر تھا، اور حضرتِ شیخ باہر تھے۔ سامنے آتے ہی صبر وضبط کا پیمانہ ٹوٹ گیا۔ محبت کا آبگینہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ معروضۂ شوق سننے کے لئے احساس کے کان درکار ہیں۔ جذبۂ الفت کی تصویر دیکھنے کو دل کی آنکھیں چاہئیں۔ ہر کوئی اشکوں کے گوہر کا شناسا نہیں ہوتا۔ الغرض سرگزشتِ وفا یہ ہے کہ قسمت کا پیچ کسی کے دستِ کرم سے ہی کھل سکتا ہے۔ بہر حال خواجہ چاچڑویؒ نے جذبات پر قابو پاتے اور آنکھوں کے آنسو اپنی آستین میں جذب کرتے ہوئے فرمایا

"مرید حسین! میں تو کوئی چیز نہیں تھا، مجھے آپ نے سچ مچ پیر بنا دیا ہے۔ پیدا کرنے والے کی قسم! آج تمہارے قدم چومنے کو جی چاہتا

ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کی جوتیوں کو سر پر تاج کی طرح سجاؤں اور گوچے گوچے میں یہ اعلان کرتا پھروں کہ یہ اس مردِ سعید کا جوڑا ہے جس نے مجھے بے دام خرید کر اپنا دیوانہ بنا ڈالا۔ یہ سب کچھ کر چکنے پر بھی حق ادا نہ ہوگا۔ آپ کے کفشِ ناز چومنا بھی یقیناً باعثِ فخر ہے۔ یہ لوگ مجھے آپ کے پاس بطورِ سفارش لائے ہیں، کیا آپ کو وہ بات بھول گئی؟ جب آپ نے والیٔ بطحا ﷺ کے قدموں پر اپنی جوانی نثار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو میں نے کیا کہا؟''

غازی صاحب نے بصد احترام عرض کیا:

''غریب نواز! مجھے اچھی طرح یاد ہے اور اس پر کاربند بھی ہوں۔ کئی دنوں سے دل میں زیارت کی خواہش مچل رہی تھی اور بلوانا گستاخی خیال کیا۔ بے چینی بڑھی تو یہ بہانہ ڈھونڈ نکالا۔ ورنہ میں اور انکار کا خیال، بھلا آغوشِ رحمت سے اٹھنا کون گوارا کرے گا؟''

یہ سن کر قلندر کریمؒ خوش ہوئے اور فرمایا:

''میں ایک ہی بات بتاتا ہوں کہ کمانا مشکل ہے اور گنوانا آسان ہوتا ہے۔ جو لوگ اس سرمایۂ حیات کو سنبھالے رکھتے ہیں ان کی زندگی ایک مثال بن جاتی ہے اور موت بے مثال''۔

اس موقع پر بطلِ جلیل نے اپنے مرشدِ کامل کو روحانی کیفیات اور قلبی واردات سے آگاہ کیا۔ نیز بتایا کہ مجھ کو ہر لحظہ حضور پرنور شافع یوم النشور ﷺ کے دامنِ کرم نے ڈھانپ رکھا ہے۔ اب تو مجھے اپنی آنکھوں پہ بھی پیار آتا ہے۔ مدح بھرے نینوں کی یہ دل نشین حکایتیں سن کر آپ میاں محمد بخش صاحب''

کے یہ اشعار پڑھنے لگ گئے۔

مر مر اک بناون شیشہ، مار وٹا اک بھندے
دنیا اُتے تھوڑے بندے قدر شناس سخن دے

جنہاں گھٹ بھر کے پیتا وحدت دے مدھ لالوں
علم کلام نہ یاد رہوے گزرے قول مقالوں

قطرہ ونج پوے دریاوے، پھر اوہ کیہ کہاوے
جس تاں اپنا آپ ونجاوے، آپ اوہو بن جاوے

غازی مرید حسین شہید سے ضلعی قید خانہ، جہلم میں کئی خرقِ عادت واقعات رونما ہوئے۔ آپ کی کال کوٹھڑی سے ملحقہ منڈی بہاء الدین کے موضع ڈنگہ کا ایک سکھ قاتل بھی اسیر تھا۔ عدالتوں سے اس کی تمام اپیلیں خارج ہو چکی تھی۔ اب اس کی سزائے موت پر عملدرآمد میں فقط چند روز باقی تھے۔ ایک رات مجرم مذکور نے دیکھا کہ غازی صاحب کا کمرہ بقعۂ نور بنا ہے اور بہت سے آدمی درود و سلام کا ورد کر رہے ہیں۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ یہ منظر مسلسل اس کے مشاہدے میں آتے رہے۔ حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے سنتری سے پوچھا "ساتھ والے کمرے میں ہر روز یہ روشنی کہاں سے آتی ہے اور مرید حسین تمام رات کس کے ساتھ محوِ گفتگو رہتے ہیں؟"۔ جواب ملا:

"یہ عقدہ مجھ سے حل نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگوں نے ایسا قیدی زندگی بھر نہیں دیکھا۔ میرے تمام ساتھی اس پر حیران ہیں۔ یہ خلافِ

عقل واقعات تو خود میں بھی نہیں سمجھ پایا۔ جونہی سورج کی ٹکیہ
مغرب کی زرّیں آغوش میں گرتی ہے یہاں میلے کا سماں ہوتا
ہے۔ عشاء کی نماز سے قبل آپ پاک صاف کپڑے زیبِ تن فرما لیتے
ہیں۔ کمرے کے در و دیوار پر مشک و عنبر چھڑک دیا جاتا ہے۔ پھر
رات گئے یہ کوٹھڑی دفعتاً جگمگا اٹھتی ہے۔ آپ کس سے محوِ کلام ہوتے
ہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے تو کبھی کسی دوسرے شخص کو نہیں
دیکھا۔ یہاں آ بھی کون سکتا ہے، البتہ روشنی کے ساتھ ہی فضا مہک
اٹھتی ہے اور ہواؤں پر خوشبو کے اثر سے نشہ سا چھا جاتا ہے۔ اس سے
آگے مجھے کچھ خبر نہیں"۔

آخر کسی طرح اس سکھ قیدی نے غازی مرحوم سے یہ راز پوچھ بھیجا،
معلوم ہوا کہ ہاتھوں میں جام و سبو اٹھائے ساقیٔ کوثر ﷺ ہی اپنے مے کش کی
پیاس بجھانے رونق افروز ہوا کرتے ہیں۔ جو آپ ﷺ کا جلوۂ زیبا دیکھ چکا ہو، اس
کی نگاہ کسی اور خوش رنگ نظارے پر نہیں ٹھہرتی۔ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس
پر مر مٹنے والوں کو جنت سے غرض رہتی ہے نہ دوزخ کا خوف۔ جو ان کے در سے
اٹھ جائے وہ دربدر مارا مارا پھرتا ہے۔ آپ ﷺ کے حضور، جبین جھکی رہے
تو عرشِ بریں پیشِ نگاہ۔ اگر سر اس دہلیز سے اٹھ جائے تو تحت الثریٰ کے علاوہ
مقدر کا ٹھکانا نہیں۔

ان کی دہلیز پہ رکھی ہے جبیں رہنے دو!
اور کچھ دیر مجھے عرش نشیں رہنے دو!

غازی صاحب کے حسنِ کردار سے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی ایک

انوکھی مثال قائم ہوئی۔ روح پرور مشاہدات نے غیر مسلم قیدی کو اسلام کی حقانیت کا قائل کر دیا۔ وہ آپ سے زبردست متاثر ہو چکا تھا۔ اس نے قبولِ اسلام کی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ کے دستِ حق پرست پر دینِ حقہ کی قبولیت کے بعد اس کا نام "غلام رسول" رکھا گیا۔ اس موقع پر مسلمان قیدیوں نے جیل میں اظہارِ خوشی کے طور پر مٹھائی تقسیم کی۔ شکرانے کے نفل ادا کیے گئے اور بعض جگہوں پر چراغاں بھی ہوا۔ یہ بات جیلر کے نوٹس میں لائی گئی جو مذہباً ہندو تھا۔ اس نے نومسلم قیدی کے ورثاء کو بلوا بھیجا۔ چونکہ اس کے حواس پر رسولِ عربی ﷺ کی غلامی کا نشہ چھا گیا تھا، لہٰذا وہ جیلر، لواحقین، اور دیگر ہندوؤں کے کسی دباؤ میں نہ آیا۔ بلکہ ملاقات سے قبل اپنے اقارب کو کہلوا دیا:

"ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں، میں تمہارا مذہب چھوڑ چکا ہوں۔ اب تعلق قائم رکھنے کی ایک ہی صورت ہے، تم مسلمان ہو جاؤ یا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔

غلام رسول کی سزائے موت پر عملدرآمد کے بعد اس کی میت حسبِ وصیت جہلم کے مشہور احراری جناب عبداللطیف کے سپرد کی گئی۔ اور اسلامی طریقے سے جنازہ پڑھ کر نہایت احترام کے ساتھ انہیں جہلم کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ جنازہ گاہ کے قریب، شہرِ خموشاں میں عاشقِ خیر الوریٰ ﷺ کے اس شاہکار کی قبر آج بھی اپنی خوش بختی پر نغمہ سنج ہے۔

شہید موصوف ایک مدت سے یومِ شہادت کا انتظار کر رہے تھے۔ جہلم کے قید خانے میں چند دن بھی انہیں بہت طویل معلوم ہوئے۔ یہاں عرصہ اسیری کے دوران ان کا اپنے ایک ہم مشرب و ہم ذوق سے تعلقِ خاطر پیدا ہوا۔

آپ کے اس دوست کا نام، غازی غلام محمد شہید ہے۔ ان کے مقدر جاگنے کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ شہنشاہِ دوعالم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا مبارک دن تھا۔ ہر طرف خوشیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ کائنات کی نعمتِ کبریٰ کے ورودِ مسعود پر کون شکر ادا نہ کرتا۔ اس روز بھی خدا تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم پر پوری ملتِ اسلامیہ سربسجود تھی۔ اظہارِ مسرت کے طور پر عید میلاد کا ایک جلوس تشکیل دیا گیا۔ فرزندانِ توحید کا یہ قافلہ، مذکورہ بالا شہر کے کسی چوراہے سے گزر رہا تھا۔ قریب ہی سکھوں کی آبادی تھی۔ سکھ مت کا ایک بدمست پیروکار آوازے کسنے لگا۔ یہ خوش قسمت مسلمان اس کے نزدیک کھڑا نہ صرف تمام اوچھی حرکات دیکھ رہا تھا بلکہ زہر میں بجھے ہوئے بیباکانہ جملے بھی اس کو سنائی دے رہے تھے۔

اسی اثناء میں جلوس کے پیچھے گدھے پر سوار کوئی آوارہ لڑکا دکھائی دیا۔ اب کے وہ انتہائی گمراہ کن دلرزہ خیز الفاظ بک رہا تھا۔ اس نے زور سے چلا کر کہا "وہ دیکھو، مسلمانوں کا نبی براق پر چڑھ کر آ گیا ہے"۔

غیور مجاہد سے نہ رہا گیا۔ بہ عجلت اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اور ٹوکتے ہوئے فرمایا:

"بے غیرت ملیچھ! اپنی زبان کو قابو میں رکھ! ورنہ میں تیری ناپاک زبان کھینچ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا"۔ مگر وہ اپنی ذلیل حرکتوں سے باز نہ آیا۔ غازی غلام محمد شہیدؒ نے غصے کی حالت میں اپنا چاقو اس کے سینے میں اتار دیا اور پے در پے وار کیے۔ وہ تھوڑی دیر تڑپا، ہائے وائے کی۔ بالآخر کتے کی موت مر کر خاموش ہو گیا۔ قاتل کی گرفتاری عمل میں آئی۔ عدالت میں مقدمہ چلا، بوقتِ فیصلہ

انہیں سزائے موت کا مستحق ٹھہرا لیا گیا۔

ان کی رہائش جہلم شہر میں دریا کے کنارے شمالی محلے میں تھی۔ اندرونِ جیل، غازی مرید حسین شہید اور ان میں پیغامات کے تبادلے ہوتے رہے۔ بہر حال یہ دونوں مجاہد اپنے اپنے کردار میں مختلف کیفیات رکھتے تھے۔ غازی غلام محمد صاحبؒ نے جذبات سے بے قابو ہو کر ہنگامی طور پر یہ قدم اٹھایا۔ اس کے برعکس غازی مرید حسین شہید نے نہایت سوچ بچار کے بعد وادیٔ جنون میں قدم رکھا۔ اول الذکر نے عدالت میں موت سے بچنا چاہا، ثانی الذکر شوقِ شہادت میں دعائیں فرماتے رہے۔ ازروئے شرع ان کا بیان، ہدفِ تنقید نہیں بنایا جاسکتا۔ لیکن دنیائے عشق میں ان کا جذبہ مستحسن ہے۔ قبلہ غازی مرید حسینؒ کی قربانی کے کچھ عرصہ بعد غازی غلام محمد نے بھی جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اور جنازہ گاہ جہلم کے قریب مشہور گورستان میں مدفون ہوئے۔

تھک کر یونہی پل بھر کے لئے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

☆☆☆

غازی مرید حسین شہید کی آرزوؤں کا چمن مہکا ہوا تھا۔ چلتے چلتے وہ منزل کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اپیلوں کے بکھیڑے نہ رہے۔ قانونی چارہ جوئیوں سے جان چھوٹ گئی۔ انتظار کی کلفتیں ختم ہوئیں۔ آپ کو واصل بحق کرنے کے لئے بروز جمعۃ المبارک ۸ رجب المرجب ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۱۹۳۷ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ تختۂ دار پر لٹکانے کے لئے تمام مراحل مکمل ہو چکے تھے۔ شب بھر جیل میں قرآنِ حکیم کی تلاوت، درود شریف کا ورد اور کلمے کا ذکر ہوتا رہا۔ مسلمان قیدیوں نے فرطِ عقیدت سے تمام رات جاگ کر گزاری۔ سرکاری ڈاکٹر اور مجسٹریٹ درجہ اول، عبدالرحیم جیل میں پہنچ چکے تھے۔ رات گئے ڈی۔ سی۔ صاحب نے جیلر کی معیت میں انتظامات کا جائزہ لیا۔ علاقے بھر کی اہم سڑکوں اور چوراہوں پر پہرے لگے تھے۔ جیل کی چار دیواری پر ایک باقاعدہ فورس، کنٹرول سنبھالے ہوئے تھی۔ انتظامیہ نے پورے شہر پر کڑی نگرانی رکھی۔ جنازہ ادا کرنے کی غرض سے تین مولوی صاحبان بھی پابند کر لئے گئے۔ کفن شہید موصوف کے لواحقین سے حاصل کیا گیا۔

غازی صاحب نے رات کا ایک حصہ شکرانے کے نوافل میں گزار دیا۔

کچھ وقت ام الکتاب کی تلاوت فرماتے رہے۔ آدھی شب کے بعد آپ درود و سلام کے ورد میں مشغول ہو گئے۔ فجر کی اذان کے وقت پھانسی دیا جانا تھا۔ اس سے تھوڑی دیر قبل ان سے غسل کرنے کو کہا گیا۔ آپ نے اس پر خوشی عمل کیا۔ انہیں خلافِ قاعدہ سفید وردی پہنائی گئی۔ (ازاں بعد یہ وردی آپ کی والدہ مرحومہ کے کفن میں شامل کی گئی۔) (مصنف)۔ مؤذن کے روح پرور نغمے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد رپورٹ دی کہ قیدی مکمل طور پر بقائمی ہوش وحواس ہے۔ حسبِ ضابطہ آپ کا وزن پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ مختلف حوالوں سے یہ روایت پایۂ تحقیق تک پہنچتی ہے کہ اس بطلِ حُریت کی صحت، گرفتاری کے وقت سے روز افزوں تھی۔ ایامِ اسیری میں ان کی رنگت نکھرتی چلی گئی۔ ہونٹوں پر ہر وقت تبسم رقص کرتا اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ہوتی۔ یومِ وصل آپ کا وزن پہلے سے پونے تین کلو بڑھ چکا تھا۔ طبی لحاظ سے اس کا سبب کیا ہے؟ میڈیکل سائنس والے اسے کون سا نام دے گے؟ بات یہ ہے کہ جذبے کبھی ترازو میں نہیں تل سکتے۔ فلسفہ محبت سمجھانے سے نہیں، سمجھنے سے متعلق ہے۔

لینا ہے ٹوٹے ہوئے ساز خوب بجتے ہیں

بڑے خلوص سے دل کا رباب لایا ہوں

بہر صورت ساقی بدست جام اور بادل گھرے ہوئے تھے۔ غرورِ حسن اور سرورِ عشق میں ٹھن گئی۔ ماحول پر چشمِ دلہن کی طرح مستی چھائی تھی۔ ایسے میں جھومتی گھٹاؤں نے دلوں کو عشق کی حلاوت سے آشنا کر دیا۔ چاندنی رات کا غلاف، چہرے سے برستا نور، پیشانی کی طلعت، نگاہوں کا جلال، امیدوں کا چمن، فراق کی لذت، دیوانۂ عشق کا کیف، نظر کا خمار، سرمدی نغموں کا ترنم، بھیگی پلکوں

کی برسات، ایمان کی تپش، لب ہائے گہر ریز کی جنبش، اور تصورِ جاناں کا اضطراب۔۔۔ یہ قیامت نہیں تو قیامت خیز منظر ضرور تھا۔ مئے توبہ شکن تھی اور توبہ جام شکن، آنکھ اٹھا کر دیکھا، تو پیمانوں کا ڈھیر پڑا نظر آیا۔ امتی کے دل میں محبوبِ امت ﷺ کے عشق کا چراغ روشن رہا تھا۔ رحمت و انوار اور محبت و دلکشی کی دُنیا، ذہن میں گھوم رہی تھی۔ لالہ رخ حسینہ کے جمال اور گل کدہ فردوس کی حور کو سرورِ کونین ﷺ کے مبارک و مقدس پاؤں کی گرد کا خراج کہنا بھی ایک ناموزوں تشبیہ ہے"۔ آپ علام الغیوب جل وعلا کے اسرار کی کان اور امکان و وجوب کے دریاؤں کی حدِ فاصل ہیں"۔

کتنی سہانی گھڑی تھی، جب مرید حسین کی قسمتِ بیدار نے آواز دی۔

"سرکارِ مدینہ ﷺ کا نورانی پیکر، دلربا چہرہ، سرمگیں آنکھیں، عطر برساتی ہوئی عنبریں زلفیں، موجۂ نور میں لہراتا ہوا عارضِ تاباں، جمالِ سراپا کا ایک ایک نقش و نگار، تصورات کی دنیا پر چھایا ہوا تھا"۔

تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے

غازیِ اسلام سر بکف، کفن بدوش اور دست بدعا، شوقِ شہادت میں سرشار نظر آرہے تھے۔ طیبہ کی تجلیوں کو آنکھوں میں بسائے، ان کے ہونٹوں پر نعتِ رسولِ مقبول ﷺ مچل رہی تھی۔ آپ کی مناجات کیا تھیں؟ مشک اذخر گویا نسیم بطحا کے پہلو بہ پہلو سوئے طیبہ چلی۔ پُر سوز نے میں صلوٰۃ و سلام کے تحفے روانہ ہو رہے تھے کہ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ جیل اور چند وارڈن آپ کی کال کوٹھڑی کے قریب آکر رُکے۔ ایک جھٹکے سے آہنی قفل کھل گیا۔ دروازے کوئی بھی ہوں، بڑی ریاضت سے کھلتے ہیں۔ حجاب یونہی نہیں اٹھ جاتے۔ زندگی بھی ایک تالا

ہے، جس کے ٹوٹ جانے سے اسیرِ وفا، محبوب خدا ﷺ کے سانسوں کی مہک میں گھر جاتا ہے۔

الغرض آپ سے کہا گیا کہ پھانسی کا وقت قریب ہوا چاہتا ہے۔ ہمارے ساتھ، سوئے دار چلیں۔ آپ کے یاقوتی ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر نمودار ہوئی اور فرمایا "شکر الحمد للہ۔ چلئے! میں حاضر ہوں"۔

جانثارِ خیر الانام ﷺ نے باہر قدم نکالتے ہی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ کہتے ہیں اللہ اکبر کی یہ آواز تین تین میل دور تک سنی گئی۔ اور ہزاروں لوگ اس صدائے عظیم کی شیرینی سے از خود جیل کی طرف بھاگتے چلے آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قید خانے کے آس پاس ایک جمِ غفیر جمع ہو گیا۔

جب تمام قیدی ہم آواز ہو کر اللہ اکبر کہتے تو فضا گونج اٹھتی۔ حضرت غازی مرید حسین، ساغر کی آرزو میں مسلسل نعرۂ تکبیر لگاتے، عالمِ شوق میں مچلتے، تیز تیز ڈگ بھرتے، اکڑتے، سنورتے، سنبھلتے، سینہ تانے اور نعت پڑھتے، پھانسی گھر کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

اب آپ نذرانۂ جاں لئے، آنکھوں میں عقیدت کے پھول سجائے، مقتل میں پورے قد سے کھڑے تھے، چہرے پر بشاشت تھی۔ پیشانی نورِ سعادت سے یوں چمک رہی تھی، جیسے یکایک افق پر کوئی روشن ستارہ نمودار ہو جائے۔ یقیناً تصورِ صاحبِ مزمل و مدثر پیشِ نگاہ تھا۔ لڑکھڑاہٹ یا گھبراہٹ نام کو بھی نہیں تھی۔ جیلر اور مجسٹریٹ گھڑیوں پر نظر ٹکائے ہوئے تھے۔ آپ نے مدینہ شریف کی طرف منہ کر کے تین بار بآوازِ بلند کلمہ شریف کا ذکر کیا اور پھر درود شریف کے ملکوتی وظیفے میں جت گئے۔ تھوڑی دیر گزرنے پر سر جھکا دیا اور بارگاہ

رسالت مآب ﷺ میں عرض کرنے لگے "میرے آقا! غلام حاضر ہے۔ بندہ اپنی حقیر جان کا تحفہ آپؐ کے قدموں پر نچھاور کرنا چاہتا ہوں۔ یا رسول اللہ! قبول فرمالیجیے!

آپ کے خونِ جگر سے وفا کا زریں باب رقم ہونے میں صرف تھوڑی دیر باقی تھی۔ کائنات کا حُسن سمٹ کر اس احاطے میں کھنچ آیا۔ اتنے میں نور و نکہت کا ایک جھونکا آیا۔ فضاؤں میں نورانی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ کنٹوپ پہنتے وقت شہیدِ ناز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ آخری وقت آپ نے پھانسی گھر میں موجود افراد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "لوگو! گواہ رہنا کہ میں نے دار پر بھی محبت کے سرمدی گیت گائے ہیں اور رسے کو چوم کر اپنے ہاتھوں سے گلے میں ڈال رہا ہوں۔۔۔ اُنْظُرْ حَالَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ"۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی جلاد نے اشارہ پاتے ہوئے تختہ کھینچ دیا۔۔ رسولِ کریم ﷺ اپنے غلامِ صادق کے استقبال کو تشریف لائے تھے۔۔۔۔ بے تاب روح، قفسِ عنصری سے پرواز کر کے اپنے آقا و مولا ﷺ کے مبارک کفِ پا سے لپٹ گئی۔۔۔ ایک ازلی پیاسا، ساقی کوثر ﷺ کے تلوے چاٹ رہا تھا۔۔۔ دریائے کرم میں طغیانی تھی۔۔۔ حور و ملائک شہیدِ رسالت کا منہ تک رہے تھے۔۔۔ وفا کی شاخ پہ ایک اور گلاب کھل اٹھا۔۔۔ پریت کی مالا میں سچے موتی کا اضافہ ہوا۔۔۔ کوئی خوش قسمت مسافر، قافلۂ شوق کا امام بن گیا۔

دل کہتا ہے کہ ہر گام پہ سجدے کروں
آنکھ کہتی ہے ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے

بیان کیا جاتا ہے کہ غازی مرید حسین شہیدؒ نے نہایت سکون کے ساتھ

جامِ شہادت نوش فرمایا۔ تختہ دار پر آپ کے جسم کو تڑپنے پھڑکنے کی بالکل زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ بس ایک ہی لحظے میں جعدِ رعنا اور زلفِ دوتا کا یہ ۲۲ سالہ دیوانہ واصل بحق ہو گیا۔ آپ کے تبرکات جن میں ایک تسبیح اور چند کتب بھی شامل تھیں، حسبِ وصیت بعض قیدیوں اور خدمت گزاروں میں بانٹ دیئے گئے۔

غازی مرید حسین شہیدؒ کی نعش کو جیل کے اندر ہی غسل دیا گیا اور نمازِ جنازہ بھی ادا کی گئی۔ ازاں بعد زیارتِ عام کے لئے آپ کی میت کو نزدیک ہی ایک وسیع میدان میں رکھا گیا۔ یہاں مضافاتی دیہات اور جہلم شہر کے ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے کثیر تعداد کلمہ گوؤں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔

شہید کے لاشہ کو بھلہ شریف تک پہنچانے کے لئے انتظامیہ نے ملک اللہ داد آف کھیال کی ایک بس پابند کر رکھی تھی۔ علاوہ ازیں دو گاڑیاں غازی موصوفؒ کے اقارب کی موجود تھیں۔ وہ منظر بڑا دلنواز تھا۔ جب آپ کی مسہری کو بس میں رکھا گیا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ عقیدت مند پھولوں کی ٹوکریں اٹھائے ہوئے آتے اور فرطِ محبت سے نچھاور کر جاتے۔ اس قدر پھول برسائے گئے کہ ان سے نہ صرف آپ کی چارپائی ڈھک گئی بلکہ بس کا اندرونی حصہ گلہائے رنگارنگ سے چمن زار میں بدل گیا۔ گاڑی کے ہمراہ پولیس کے چند آدمی بھی موجود تھے۔

جہلم تا بھلہ، کریالہ قریباً پچھتر میل فاصلہ ہے۔ اس طویل راستے میں سڑک کے کنارے متعدد جگہوں پر فرزندانِ توحید اور غلامانِ مصطفیٰ ﷺ نے ناقابلِ فراموش جذبات کا مظاہرہ کیا۔ راٹھیاں میں پلائی وڈ کے قریب شہید رسالت کی لاش دوسری بس کی زینت بنی۔ ایک بااختیار سرکاری افسر نے الحاج

خیر مہدی صاحب سے وصولیٔ نعش کی رسید پر دستخط کروائے۔ جہلم کے علاوہ راستے میں اَن گنت مقامات پر، جن میں دینہ، سوہاوہ، کھوتیاں، یلھال مغلاں، ڈوہمن، خان پور اور ڈوب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جنازہ ادا کیا گیا۔ پیر ترمنی صاحب نے خیر مہدی سے کہا کہ وارث کو چاہیے کہ صرف آخری بار جنازہ پڑھے۔ سہگل آباد کے ایک کھلے میدان میں حضرت بابا زمان شاہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ موضع ڈوب میں آپ کے لاشے کا استقبال کرنے کے لئے آرائشی دروازے بنائے گئے اور رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی گئیں تھیں۔

سڑک کے دونوں کناروں پر بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کا ایک عظیم اجتماع تھا۔ دو دو تین تین میل کے فاصلے پر لوگوں نے بغرض جنازہ صفیں درست کر رکھی تھیں۔ ان کے سامنے گاڑی روک دی جاتی اور وہ نماز ادا کر کے شاد کام ہوتے۔

الحاج چودھری حاجی خان صاحب نمبردار سکنہ سلطان آباد (کھوتیاں) جو اُس زمانے میں جہلم کچہری کے عرائض نویس تھے، کا بیان ہے کہ جہلم شہر میں مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ شہر کے علاوہ دور ودراز کے دیہات وقصبات سے بھی مسلمان جوق در جوق آئے اور آپ کے جنازے میں شرکت کی۔

راستے میں لحہ بہ لحہ اس انبوہِ کثیر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بھلہ شریف میں تو حاضرین کی تعداد گنتی سے باہر تھی۔ اس خطہ میں شاید ہی کبھی ایسا ہجومِ خلائق دیکھا گیا ہو، جدھر آنکھ اٹھتی اور جہاں تک نظر کی رسائی ہو سکتی، مخلوقِ خدا کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔

غازی مرید حسین شہید کے مزار مبارک سے لے کر کریالہ کی بوہر گراؤنڈ تک اور شمالاً جنوباً وسیع رقبے میں زائرین کا میلہ لگا تھا۔ کہتے ہیں دس ایکڑ کی فصل تو بالکل پامال ہو کر رہ گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تین لاکھ خوش قسمت افراد جنازے کی نماز میں شریک ہوئے۔ یہاں نمازِ جنازہ مولوی غلام محمد صاحب نے پڑھائی۔ قریباً چار بجے کا وقت تھا۔

ملک بھر سے جید علماء کرام اور مشائخ حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ ترمنی شریف کے سجادہ نشین تو جیسے دیوانے ہو گئے ہوں۔ بار بار آپ کے چہرۂ انور کی زیارت کی اور اپنا گریبان چاک کر لیا۔

روایت ہے کہ جنازہ پڑھانے کے لیے پیر صاحب گولڑہ شریف سے عرض کیا گیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور تڑپ کر کہا: "قبلہ شہید میرے تصورات کی دنیا سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ میں آپ کے جلووں کی تاب نہ لا سکوں گا۔

کہا تھا تو نے کفِ کائنات کھول کے دیکھ
جو میں نے دیکھا تو ہر سمت تیرا چہرہ تھا

نمازِ جنازہ ادا کر چکنے پر لوگوں کو آپ کے پُر جلال چہرے کی زیارت کروائی گئی۔ غلام عائشہ کا لختِ جگر بعد از مرگ بھی مسکراتا دکھائی دیا۔ رُخِ تاباں سے اطمینان اور سُرور جھلک رہا تھا۔ جانے آپ کی مسہری پر مشک و عنبر کی کتنی بوتلیں چھڑکی گئیں۔ پھولوں کا تو حساب نہیں ہے۔ لوگ کندھا دینے کے لیے دیوانہ وار لپک رہے تھے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہوں نے آپ کے سفرِ آخرت کا نظارہ کیا۔ بظاہر آپ کا جسم بے جان دکھائی دیا مگر اس میں بھی ایک ندرت

تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آپ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں: "جو حضورِ اکرمؐ کے نام پر فدا ہو جائے، موت کا فرشتہ اسکے وجود سے دور رہتا ہے۔ انہیں ایسی زندگی عطا کی جاتی ہے جو وہم و گمان سے بھی ماورا ہو۔ اہلِ بصیرت ہو تو دیکھو کہ فنا کا ہاتھ مجھے کبھی بھی چھو نہیں سکے گا۔ اس موقع پر خاکسار تحریک کی ایک جماعت نے چودھری گل شیر، سالار چکوال کی قیادت میں آپ کو سلامی پیش کی۔

تیری نگاہ، غرور ان کا توڑ دیتی ہے
وہ حادثے جو بہت سر اٹھا کے چلتے ہیں

جنازے کے تمام مناظر کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کیے گئے۔ جناب نثار قطب صاحب کے ایک فرزند ارجمند مرحلۂ تدفین تک لمحہ لمحہ کی عکس بندی کرتے رہے۔ غازی مرید حسین شہید کے لئے صندوق پہلے سے ہی تیار تھا۔ چونکہ ہر شخص عقیدتاً قبر کھودنے میں شریک ہونا چاہتا تھا، اس لئے یہ خاصی کشادہ تیار ہوئی۔

جب آپ کے جسدِ مبارک کو صندوق میں لٹا دیا گیا تو تین اجنبی آگے بڑھے۔ ازاں بعد معلوم ہوا کہ ان تینوں کا تعلق آستانۂ عالیہ چاچڑ شریف سے ہے۔ ان کے اسمائے گرامی علی الترتیب حسبِ ذیل ہیں:۔ قاضی غلام مہدی صاحب، بسمل صاحب، نبی بخش صاحب۔

قاضی صاحب موصوف کا تعلق خواجہ چاچڑوی کے قریبی حلقے سے تھا۔ بسمل صاحب مریدِ خاص، جب کہ آخر الذکر وہاں کے رہائشی اور درباری قوال تھے۔ ان اصحاب کو قلندر کریمؒ نے شہیدِ رسالتؐ کی آخری رسومات میں حاضری کی غرض سے بھیجا۔ ان کی خواہش پر نعشِ مبارک کے اردگرد کپڑا تان کر

پردہ کردیا گیا۔ قاضی صاحب کی آنکھیں پُر نم تھیں۔ وہ اپنا منہ، شہید اسلام کے بائیں کان کے نزدیک اس انداز میں لے گئے، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ انہوں نے آپ کے کان میں کیا کہا، معلوم نہیں ہوسکا۔ تاہم جب یہ واقعہ پیش آیا تو قریب کھڑے ہوئے لوگوں کے بقول "دفعتاً غازی مرحوم کی دونوں کسی حد تک آنکھیں وا ہو گئیں، ان کے ہونٹوں پر اس قدر واضح مسکراہٹ نمودار ہوئی کہ موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے صاف و شفاف دانت واضح نظر آنے لگے۔ گمان گزرا جیسے آپ کسی دوست کا پیغام یا کوئی خوش کن خبر سن کر قہقہے میں محو ہیں"۔

اے رگِ جاں کے مکیں، تو بھی ذرا غور سے سُن

دل کی دھڑکن تیرے قدموں کی صدا لگتی ہے

الحاج چودھری خیر مہدی بتاتے ہیں کہ میں بھی اس حیرت انگیز واقعے کا عینی شاہد ہوں۔ ہم نے قاضی مذکور سے بہ اصرار پوچھا کہ آپ نے شہیدِ رسالت ؐ کے کان میں کیا کہا؟ مگر انہوں نے صرف اس قدر بتایا کہ مجھے قلندر کریمؒ نے ایک پیغام دے کر بھیجا تھا جو بوضاحت نہیں بتا سکتا۔ پس میں نے قاصد کی حیثیت سے وہ الفاظ حضرت شہید کو پہنچائے ہیں۔

آخر کار بعد نمازِ جمعہ قریباً چار بجے آپ کو بھلہ شریف کے نزدیک "غازی محل" میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ لحد میں صندوق سے جو اضافی جگہ بچ رہی اس میں عقیدت مندوں نے پھول پھینکنے شروع کیے اور چند لمحات کے بعد آپ پتیوں کے ڈھیر میں دب گئے۔ آپ کے دوست مولا بخش نے پتھر لگائے اور مٹی ڈالنے کا کام مکمل کیا گیا۔ حورانِ خلد، کشورِ حسن کے احاطے میں اشارۂ ابرو سے کہہ رہی تھیں: "شہنشاہِ دوعالم ﷺ کی رحمت کا تقاضا تھا کہ پسینے کے چند قطرے کفن کی

چادر پر ٹپک گئے ہیں۔ اب ان کی خواب گاہ صبحِ محشر تک مہکتی رہے گی"۔

یوں بکھیرو نہ اپنی زلفوں کو
بادہ خواروں کو نیند آتی ہے

بھلہ کریالہ کے بالکل قریب شمال مشرق میں پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ غازی محل میں کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو زیبائی ورعنائی کا ایک نیا جہان نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ مقبرۂ شہید گویا آئینے کے سامنے آئینہ ہے۔ نہایت دلکش اور حسین و جمیل نقشہ۔ ایک خوبصورت مسجد، حجرہ، مجلس خانے، کنواں، مسقف نما، برآمدہ اور لنگر خانہ۔ مرقدِ غازی کے دائیں طرف آپ کی والدہ حضورؒ کا مزار ہے، جو ۱۹۶۲ء میں فوت ہوئیں۔ بائیں سمت شہید موصوفؒ کی رفیقۂ حیات آرام فرما ہیں، جن کا سانحہ ارتحال ۱۹۸۳ء کو پیش آیا۔ غازی صاحبؒ کی والدہ مرحومہ نے بقیہ زندگی کے زیادہ ایام، غازی محل میں ہی بسر کیے۔ آپ کی اہلیہ نے بھی نکاحِ ثانی پسند نہیں کیا اور صبح و شام اپنے عظیم خاوند کی تربت کے قریب رہیں۔

ابتداً چھت کے لئے لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ اب اس کی جگہ سنٹر نے لے لی ہے۔ مزار کا سنگِ بنیاد قلندر کریمؒ نے تدفین کے تین دن بعد اپنے دستِ مبارک سے رکھا۔ کام شروع ہوا تو شہید موصوفؒ کے ایک تعلق دار، امیر محمد خان نامی نے جو ہانگ کانگ میں سروس کرتے تھے، کچھ رقم از راہِ عقیدت پیش کی۔ زیادہ تر مصارف اہل خانہ نے خود ہی برداشت کیے۔ پہلے مجاور کا نام مہر دین ہے، جو ہندوستان کے کسی شہر سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ غازی محل میں بہت سے لوگ مدفون ہیں۔ اہلِ دل کے نزدیک اس جگہ دفن ہونا سعادت ہے۔

باغِ بہشت کے کئی دریچے اس سمت کھلتے ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ ہوا فرحت وتازگی بخشتی رہتی ہے۔

رات کی رانی کا جھونکا تھا کسی کی یاد میں
دیر تک آنگن میرے احساس کا مہکا رہا

غازی مرید حسین شہید کی خواب گاہ، ادب واحترام کی دنیا میں شیشے کا نرم ونازک گھر ہے۔ مئے آتشیں کے نشہ میں چور، عالمِ رفتہ وحال میں مسرور، یہاں جو بھی آیا وہ پلک نوا تھا اور دیدہ بہ گزیاں۔ حسیناؤں نے ان کی صبا خرامی اور نکہت رفتاری کے آگے اپنی گول مٹول اور چمکدار آنکھیں بچھائیں۔ ان کا تعارف، سر خمیدہ اور اخلاقِ حمیدہ کے حوالے سے ہے۔ آستانۂ شہیدؒ کا ہر زائر اشکوں کے موتی لٹا گیا۔ یہاں درد وسوز کی دولت عام ہے۔ سوز سے سوزِ جگر مراد ہے۔ اور درد سے وردِ دل۔ اس درگاہ سے شاید ہی کوئی بے آشام، تشنہ لب اٹھا ہو۔ بے طلب ملتا ہے مگر بقدرِ ظرف۔ آپ کا مقبرہ آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ شوقِ زیارت میں ہزاروں لوگ حاضری دیتے ہیں۔ ہر ایک کے آنے کا رنگ علیحدہ ہے اور جانے کا ڈھنگ بھی جدا۔ یہ زیارت گاہِ عام وخاص ہے۔ مگر فیض جدا جدا۔ کسی کو جھومتی زندگی مل جاتی ہے، کسی کو راہ کے پیچ وخم۔ اپنے اپنے مقدر اور تلاش کی بات ہے۔

☆☆☆

حضرت قبلہ قلندر کریمؒ، غازی مرید حسین شہید کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے پھانسی سے ایک دن پہلے جہلم میں ملاقات کی اور لالہ موسیٰ چلے گئے۔ دو تین روز بعد بھلہ شریف میں قدم رنجہ فرمایا۔ بعض لوگوں نے پوچھا کہ حضور! آپ تجہیز و تکفین کے وقت کیوں تشریف نہ لائے؟ جواب ملا: محبوبِ الٰہی، حضرت نظام الدینؒ نے آخری وقت میں حضرت چراغ دہلویؒ کو وصیت فرمادی تھی کہ امیر خسرو کو میری قبر پر نہ آنے دینا، اس کا سبب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ان کے آنے سے باطن کا راز فاش ہو سکتا ہے، پردۂ لحد اُن سے برداشت نہ ہو سکے گا، نہ داغِ ہجر کا کرب، میں جھیل سکتا ہوں۔

خواجہ چاچڑویؒ قلندرانہ صفات کے حامل تھے۔ جذب و مستی ان کے ہر گوشۂ زندگی پر محیط ہے۔ بعد از شہادت تو گویا آپ اپنے مرید کے دیوانے ہو گئے تھے۔ ہر وقت روتے رہتے، البتہ ان کے ذکر سے خوش ہوتے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے: "بات تب بنتی ہے جب پہچان کروانے والا موجود ہو اور کرنے والا

بھی۔اصل میں درد والے ہی فرزانے ہوتے ہیں مگر بظاہر یہ لوگ دیوانے دکھائی دیتے ہیں"۔

ایک روز اہل مجلس سے فرمایا: "مرید حسین کے مقامِ عشق کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔اگر اس کے عشق کی ایک چنگاری بھی کسی کے خرمنِ فکر پر پڑ جائے تو خدا قیامت تک اس کی قبر سے بھی شعلے بلند ہوتے رہیں۔

ایک بار آپ سے پوچھا گیا کہ کبھی غازی صاحبؒ کی زیارت ہوئی ہے یا نہیں ؟۔ارشاد فرمایا: "میرے جیسے گنہگار کو زیارت ؟ یہ فرماتے ہوئے آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔اور بے ساختہ پکار اٹھے:

"مجھ میں وہ مستی کہاں جو میرے دیوانے میں ہے"

عرصہ ہائے دراز سے الحاج خیر مہدی، قلندر کریم حسب الحکم، آپ کے دن میں کم از کم ایک بار ضرور حاضر ہوا کرتے ہیں۔بقول ان کے ایک دفعہ قلندر کریمؒ نے مجھ سے استفسار فرمایا کہ آستانہ عالیہ، غازیؒ کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔میں نے عرض کیا: اس کام پر ایک نوکر لگا رکھا ہے۔یہ سن کر خفگی کے انداز میں فرمایا: میاں محمد بخش صاحبؒ نے لکھا ہے:

غیراں ہتھوں جائز ہوندی جے خدمت دلبر دی
بادشاہاں دے بدلے یارو خلق نمازاں پڑھدی

پیر صاحب نے غازی مرید حسین شہید کا مقبرہ اپنی زیرِ نگرانی تعمیر کروالیا۔روزِ شہادت کے بعد آپ زیادہ مدت، بھلہ شریف میں ہی ٹھہرے رہے۔ آخری دنوں میں جب آپ حالتِ سکر میں تھے اور عام ملنا جلنا بند کر رکھا تھا، بذریعہ مکتوب شہیدِ محبت کے اقارب کو چکڑ شریف بلوالیا۔ان لوگوں کو دیکھتے ہی آپ وجد

میں آ گئے۔ اور فرمانے لگے "خدا کی قسم! میرا جسم تو یہاں پڑا ہے لیکن روح ہر وقت بھلہ میں رہتی ہے۔ اگر مرشد کا حکم نہ ہوتا تو میں اپنی قبر بھی مرید کے قدموں میں بنواتا"۔

تجھ کو خبر نہیں تیری ذُلفوں کے پیچ و خم

دنیائے حادثات کا عنوان بن گئے

حضرت خواجہ قمر الدین سیالویؒ جب بھی اس علاقے میں تشریف فرما ہوتے تو غازی محل کی زیارت ان کا معمول تھا۔ جب آپ احاطۂ مزار میں داخل ہونے لگتے تو عجب کیفیت ہوتی۔ اپنے کندھے کا رومال گلے میں ڈال لیتے اور کونے ہاتھوں میں پکڑ کر بادیدہ نم رہتے۔ دیر تک لحد مبارک کے اوپر ان کا سرِ نیاز جھکا رہتا۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری ہوتا تھا۔ قبر کو بوسہ دیتے اور پھر چند ثانیے نہایت احترام سے علیحدہ کھڑے رہتے۔

رب نواز (ڈسپنسر) آف ڈوہمن کا بیان ہے "مجھے غازی صاحب سے کوئی خاص عقیدت نہیں تھی اور کبھی مقبرے پر حاضر بھی نہیں ہوا تھا۔ مگر آج سے قریباً پانچ سال پہلے کا ذکر ہے، ایک روز میں نے خواب میں دیکھا کہ اچانک غازی مرید حسین شہید کے مزار پر حاضر ہوں۔ مسجد کے صحن میں ایک خوبرو نورانی صورت نوجوان تکیہ لگا کر بیٹھے ہیں۔ میں نے ان سے غازی محل کے متعلق دریافت کیا۔ ارشاد ہوا۔ تشریف رکھئے۔ میں ہی صاحبِ مزار ہوں۔ اس پر میں دست بستہ عرض کرنے لگا کہ میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔ انہوں نے کہا ذرا ٹھہریے۔ میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نور کا ایک جانفزا جھونکا آیا۔ زمین سے آسمان تک اجالا ہو گیا۔ اسی اثناء میں رسولِ اکرم ﷺ جلوہ فرما ہوئے۔ اس وقت

غازی صاحب استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ میرا تعارف کروایا گیا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ آج تک یہ نشہ میرے حواس پر چھایا ہوا ہے۔ میرے مقدر کا ستارہ چمک اٹھا تھا۔ صبح گاڑی لے کر بھلہ شریف آیا اور مقبرے کی زیارت کی۔ یہاں ہو بہو وہی منظر تھا جو رات میں نے خواب میں دیکھا۔

اس طرح ایک دو نہیں، بلکہ سینکڑوں خارقِ عادت واقعات رونما ہوئے ہیں۔ غازی صاحب کو جامِ شہادت نوش فرمائے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ایک رات چودھری محمد بخش صاحب کو خواب میں ملے اور فرمایا پہلے میں قید خانے میں تھا، اب آزاد ہوں۔ میری ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ جہاں جی چاہتا ہے چلا جاتا ہوں۔ مجھے ہر وقت رسولِ پاک ﷺ کے جلوے نصیب ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی انہیؐ کے پاک قدموں میں گزر رہی ہے۔

دامانِ زندگی پہ ہیں کچھ بد نما سے داغ
گزرے جو لمحے نام تیرا لئے بغیر

جب غازی مرید حسین شہید کا مقبرہ تکمیل کے مرحلے سے گزر چکا تو تعویذ مبارک سے شہد رسنا شروع ہو گیا۔ اس سے ہر روز ہزاروں زائرین فیضیاب ہوتے رہے۔ خواجہ غلام نصیر الدین نے "مرقعِ قلندر" میں اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ محبت کے عالم میں حضور قلندر کریمؒ سے رہا نہ گیا تو غازی صاحب کے مزار پر بوسہ دیا۔ جس جگہ آپ نے بوسے کے لئے دہن رکھا، وہاں سے شہد نکلنے لگا۔ اس وقت آپ کے پاس چند غلامانِ باصفا بھی موجود تھے اور ضلع جہلم کے ہزاروں باشندے اس شہد سے مستفید ہوئے۔ جب اس بات کا راز افشا ہوا تو شہد نکلنا بند ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا کاش تم اس راز کو سربستہ رکھتے تو واللہ!

یہ شہد روزِ حشر تک اس مزارِ مقدس سے نکلتا رہتا۔

راقم الحروف کو اس بارے میں مزید معلومات ملی ہیں۔ شہد کا یہ فیض تین چار ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران پورے علاقے میں اس عجوبہ کی شہرت پھیل چکی تھی۔ ہزاروں افراد نے اس سے اپنے ذہن شیریں کیے۔ جب خواجہ قلندر کریمؒ کو اس بارے میں بتایا گیا تو آپ نے تعویذ کو از سرِ نو تعمیر کروانے کا حکم دیا۔ اس پر عمل کیا گیا اور یوں شہد نکلنا بند ہو گیا۔

علاوہ ازیں خاندان کے جملہ ارکان کا بیان ہے کہ ہمارا اشرف و وقار صرف غازی مرید حسین شہیدؒ کی نسبت سے ہے۔ آپ سے انتساب کے سبب وہ کونسی نعمت ہے جو ہم پر نہیں اتری۔ عزت ہمارے حصے میں آئی۔ بڑے بڑے عظیم المرتبت مشائخ کرام نے ہمیں اپنی آنکھوں پر بٹھایا۔ اتنی نوازشوں کے مستحق ٹھہرائے گئے کہ شمار ممکن نہیں۔ لاتعداد کمالات ہمارے مشاہدے میں آئے، آرہے ہیں اور اللہ کے فضل سے آتے رہیں گے۔ اس روداد کی ایک عظیم کڑی الحاج خیر مہدی صاحب کے خوش قسمت فرزند دلبند غلام اکبر بیان کرتے ہیں:۔

"میں خانہ کعبہ کے طواف میں محو تھا کہ یکایک میرے دل میں یہ خواہش مچل اٹھی کہ کاش مقدور ہو اور میں حرم شریف کے اندرون داخل ہو کر نفل گزار سکوں۔ حُسنِ اتفاق سے اسی دن بیت اللہ شریف کا دروازہ بھی کھولا جانا تھا۔ اس لئے کہ غسل کے پروگرام کو آخری شکل دی جائے۔ میرے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن پیدا ہوئی۔ احساسات کہہ رہے تھے کہ مجھے مایوسی نہ ہو گی۔ مجھے کسی طرح پتہ چل گیا کہ جن صاحب کے زیرِ نگرانی یہ تمام کام ہونا ہے وہ میرے

پاس ہی سے گزر رہے ہیں۔ میں غیر ارادی طور پر ان کے پیچھے چل پڑا۔ میری چال سے انہیں گمان گزرا کہ تعاقب کیا جارہا ہے۔ وہ اچانک رُک گئے اور پیچھے آنے کی وجہ دریافت کی۔ بندے کی زبان سے بلا جھجک آرزو کا اظہار ہو گیا۔ انہوں نے کہا "یہ کام آسان نہیں ہے۔ بہر حال آپ کل علی الصبح مجھے مسجد الحرام کے صدر دروازے پر ملیں"۔ ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ جانے کیا وجہ ہے کہ میں آپ کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ رات بھر مجھے اضطراب رہا۔ یہ تو بتایئے کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اور اس کشش کا سبب کیا ہے؟ میں نے غازی صاحب کے تعارف اور ان سے اپنی نسبت کا مکمل حال بیان کیا۔ وہ میرے ساتھ چل پڑے مگر رضا کار نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا کہ تمہارے پاس اس کا اجازت نامہ نہیں ہے۔ میرے اجنبی کرم فرمانے بہتیری کوشش کی، لیکن کوئی محافظ بھی اپنے طور پر اجازت دینے کے حق میں نہیں تھا۔ بالآخر یہ بات سلطانِ وقت کے علم میں لائی گئی اور اس نے تمام صورتِ حال سے آگاہ ہو کر مجھے اس شرف سے بہرہ ور ہونے کا حکم جاری کر دیا۔ کہاں میں اور کہاں یہ قسمت! اب بھی سوچتا ہوں تو مقدر پر غرور آجاتا ہے۔ انہی کی نسبت کا اثر ہے کہ میرے ایمان کا چمن مہک اٹھا۔ آپ ہر وقت میرے ساتھ ہوتے ہیں، میں تنہا کب ہوں"۔

تیرے نام کی خوشبو شامل کر لیتا ہوں
خالی سانس تو سینے میں کنکر لگتا ہے

☆☆☆

غازی مرید حسین شہید کے تعارف کی خاطر یہ حوالہ ہی کافی ہے کہ وہ رسولِ پاک کے عاشقِ صادق تھے۔ اسی جذبہ حقیقی کے بدولت پسِ دیوارِ زنداں پہنچے۔ کچھ عرصہ قید رہے اور جامِ شہادت فرما کر دائمی عزت و لازوال شہرت کے مستحق قرار پائے۔ بناء بریں اُن کی زندگی کا ایک پہلو ذوقِ ادب اور شاعری سے عبارت ہے۔ اُن کے مخطوطات، ملفوظات، اور نگارشات ایک نقاد کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ بحیثیت شاعر و ادیب بھی اُنکا قد کاٹھ نہایت بلند و پُر کشش ہے۔ جہدِ مسلسل کے بعد ان کا جو کلام بہم پہنچا وہ اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ اگر اُن کا تمام سرمایۂ سخن اور خطوط دستیاب ہو جاتے تو شہید موصوف اس حوالے سے بھی بڑا نام پاتے۔ مگر اِسے گردشِ دوراں کہیئے یا ناقدری عالم کا صلہ کہ اس متاعِ بے بہا کا بہت بڑا حصہ ہم سے چھن گیا۔ شاید قدرت کو یہ گوارا ہی نہ تھا کہ ناموسِ رسالت کا غیور محافظ، بلحاظِ ادیب یا شاعر پہچانا جائے۔

قبلہ غازی صاحب کے مطبوعہ کلام کے مرتب محمد منیر نوالی صاحب ایم۔ اے نے تلاش و جستجو کا حال کچھ یوں بیان کیا ہے:

"جنوری ۱۹۷۵ء کی بات ہے محترم پروفیسر ملک انور بیگ اعوان صاحب گورنمنٹ کالج چکوال سترھویں صدی کے نامور صوفی شاعر حضرت شاہ

مراد خانپوریؒ (علاقہ مشرقی چکوال) پر تحقیق کر رہے تھے۔ آپ کے کئی مضامین اخبارات میں اشاعت پذیر ہوئے۔ جو علمی اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اس پر میں نے پروفیسر صاحب کی توجہ عاشقِ رسول ﷺ غازی مرید حسین شہید اور ان کی شاعری کی طرف مبذول کرائی اور ان سے درخواست کی کہ پروانۂ شمعِ محمدیؐ پر بھی قلم اٹھائیں۔ اس گزارش کے جواب میں اعوان صاحب نے ۲۱؍ جنوری ۱۹۶۵ء کو ایک خط کے ذریعہ مجھے مطلع فرمایا کہ غازی مرید حسینؒ کا کلام آئندہ عرس (یومِ شہادت) تک چھاپ دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔۔۔ میں مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ اردو مجلسِ چکوال کی کارکردگی پر مجھے بھروسہ تھا۔ اسی سال کے دوران دارالاشاعت اردو مجلسِ چکوال کی اوّلین پیشکش "سبزۂ بیگانہ" منصۂ شہود پر آئی۔ پروفیسر انور بیگ صاحب "سبزۂ بیگانہ" کی مجلسِ ادارت کے ممتاز رکن تھے۔ انھوں نے بکمالِ مہربانی اپنے دستخطوں سے ۲۴؍ ستمبر ۱۹۶۵ء کو وہ کتاب مجھے عنایت فرمائی۔ اس میں دھنی کے متعدد فنکاروں کی علمی وادبی تخلیقات بصورتِ نثر چھپی تھیں۔ بیگ صاحب کا یہ مضمون بھی ان میں شامل تھا "غازی مرید حسینؒ، شمعِ رسالت کا پروانہ"۔ یہ مضمون میرے لیے بڑی روحانی کشش رکھتا تھا۔ کتابی سائز کے سولہ صفحات پر پھیلے ہوئے اس مضمون کو دیکھتے ہی دیکھتے پڑھ ڈالا۔ پروفیسر صاحب کی کاوش اپنی جگہ پر قابلِ داد تھی۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میری تشنگی باقی رہی۔ اس لئے غازی صاحبؒ کے حالاتِ زندگی، کارنامے اور شاعری کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی آرزو لئے نگری نگری پھرا۔ بہت سے بزرگوں سے ملتا رہا۔ کئی بار بھلہ شریف گیا۔ غازی صاحبؒ کے عزیز چودھری خیر مہدی صاحب نمبردار بھلہ شریف اور دوسرے

حضرات سے یہ سن کر دلی صدمہ ہوا کہ غازی صاحبؒ کا کلام، خطوط اور دوسری نگارشات مولوی ممتاز علی صاحب ایم۔ اے (سابق ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول چکوال حال ہیڈ ماسٹر پرائیویٹ ہائی سکول کریالہ) کے ہاں سے ضائع ہو چکی ہیں۔ میرے لئے اس ضیاع پر یقین کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ کئی طرح سے تحقیق کرانے پر آخر یہی معصومانہ جواب ملتا رہا "ہر شے گم ہو گئی ہے"۔۔۔! میں اس قومی وملی اور ادبی سرمایہ کی گمشدگی اور ضیاع پر چپکے چپکے آنسو بہا کر بحرِ سکوت میں غرق ہو گیا۔ لیکن آرزوئے ناتمام اور عاشقِ رسولؐ کی روح نے پل بھر چین نہ لینے دیا۔۔۔ ایک بار پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

اب کے عزیزی اخلاق احمد متعلم گورنمنٹ ڈگری کالج چکوال اور برادرم چودھری محمد ایوب صاحب معلم کالج ہذا نے دستِ تعاون دراز کیا۔ انہوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ غازی صاحبؒ کی نگارشات میں سے کوئی بھی کہیں سے دستیاب ہو جائے۔ بقول میاں محمد بخش صاحب سیف الملوک!

"لوڑن ڈالا رہیا نہ خالی تے لوڑ کیتی جس پکّی"

تلاشِ بسیار کے اور جہدِ مسلسل کے بعد اخلاق احمد کے ذریعے اللہ نے میری قلبی آرزو پوری کر دی۔ ہوا یوں کہ ملک اخلاق احمد کے ایک قریبی عزیز اور غازی صاحبؒ کے محبّ وہم نام رشتہ دار نوجوان مرید حسین کے ہاں جب اچھی طرح تلاشی لی گئی تو خوش قسمتی سے ایک انتہائی بوسیدہ کاپی مل گئی جس میں غازی صاحبؒ کے دستِ مبارک سے پنسل کا لکھا ہوا کچھ پنجابی اور اردو کلام تھا۔ پروفیسر انور بیگ صاحب اعوان کے جس مضمون کا گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے اس میں جن چوالیس پنجابی اشعار کی مدد کے ساتھ غازی صاحبؒ پر قلم اٹھایا گیا تھا وہ

بھی اس کاپی میں معمولی فرق کے ساتھ درج ہیں۔ اس کاپی کی بدولت ہی انکشاف بھی ہوا کہ غازی صاحبؒ کا تخلص نہ صرف ایم ایچ بلکہ اسیر بھی تھا اور آپ پنجابی کے ہی شاعر نہ تھے (جیسا کہ محترم اعوان صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا) بلکہ اردو میں بھی بہت پیارے شعر کہتے۔ بہر کیف آپ کی شاعری پر اظہارِ خیال سے پہلے اس تاریخی کاپی کے بارے میں چند ضروری گزارشات پیش کی جاتی ہیں۔

☆ کاپی میں تمام اشعار کالی پنسل سے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن صفحات کے نمبر سرخ پنسل سے لگائے گئے ہیں۔ بعض صفحات بڑی دقت سے پڑھے جاتے ہیں۔ یقین کیجئے کہ ایک اردو غزل اتنی مسخ ہو چکی ہے کہ اس کے پانچ اشعار پڑھنے کے لئے تقریباً پانچ دن صرف کرنے پڑے۔ اسی طرح ایک اردو شعر کا آخری حصہ بالکل ہی نہیں پڑھا جاسکا اور جسے چاچڑ شریف کے ایک قوال کے ذریعے مکمل کیا جاسکا۔

☆ کاپی کے کل صفحات چوہتر تھے لیکن ان میں سے تیس صفحات کالی، چوبیس غائب اور صرف بیس صفحات پر اردو اور پنجابی تحریریں ہیں۔ غائب شدہ صفحات کے نمبر یہ ہیں: ۱تا۶، ۱۵تا۱۸، ۲۷تا۳۵، ۳۷تا۴۴، ۵۱تا ۵۲۔ جو صفحات موجود ہیں اور ان پر کلام تحریر ہے وہ یہ ہیں۔ ۷تا۹، ۵۵تا۵۹، ۶۱تا۷۰، ۷۳تا۷۴۔۔۔!

☆ غائب اور موجود لکھے ہوئے صفحات کی ترتیب دیکھ کر قیاس کہتا ہے کہ غائب شدہ صفحات پر بھی کلام ہو گا۔ لیکن بد قسمتی سے ان سے ملک وملت اب محروم ہو چکے ہیں۔

☆ پنجابی کلام میں زیادہ تر ایم ایچ (مرید حسین) اور اردو میں اسیرؔ

لیکن بعض اشعار میں دونوں تخلص اکٹھے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔

☆ اردو کلام میں دو شعر ایسے بھی ہیں جن میں اردو اور پنجابی ملی جلی ہے۔ نیز اردو کلام کے شروع میں غازی صاحب نے خود یہ عنوان دینا پسند فرمایا ہے ــــ ''خیالاتِ اسیر ......'' لیکن پنجابی کلام کے آغاز میں کوئی بھی عنوان نہیں ہے ــــ!

نوابی صاحب کی بیان کردہ روداد اور بیاض کی آپ بیتی اس خیال کو تقویت بخش کر یقین کے دَر تک پہنچا دیتی ہے کہ پھٹے ہوئے اوراق پر بھی شہید موصوفؒ کا اردو پنجابی کلام درج تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ خود اُن کی مبینہ روایت مندرج صفحہ ۷۲ کے مطابق غازی صاحبؒ کے ہم جماعت دوست الحاج ملک محمد حسین صاحب مقیم رحیم یار خاں نے بتایا کہ دورانِ قید، شمعِ رسالتؐ کے جانباز پروانے نے اپنے متعدد اشعار ایک کتاب پر لکھ کر مجھے بھیجے تھے۔ وہ کتاب ضائع ہو چکی ہے لیکن یہ شعر تاحال یاد ہے۔

دنیا سے دل لگا کے تجھے کیا ملا اسیرؔ
اب عشقِ مصطفیٰؐ میں بھی جاں دے کے دیکھ لے

الغرض اس حوالے سے بات مزید آگے بڑھتی ہے اور مرتبِ مذکور کا یہ خیال بھی محلِ نظر محسوس ہوتا ہے کہ غازی صاحبؒ نے حالاتِ قید میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اُن کا اندازِ بیان، الفاظ کی بندش، رفعتِ خیال، بحور و اوزان کا پاس اور کلام میں پختگی یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ انہوں نے سنِ شعور میں قدم رکھتے ہی مشقِ سخن آرائی شروع کر دی تھی۔ نیز آپ ابتداء سے ہی خوش فکر تھے۔ مزید بر آں یہ کہ مذکورہ بیاض کے علاوہ، بھی کئی جگہوں پر شہیدِ رسالتؐ کا منظوم کلام

موجود تھا۔ ملک صاحب محمد حسین کے بیان کے علاوہ چودھری خیر مہدی صاحب کی روایت بھی قابلِ غور ہے۔ جس میں آپ کے ادب پارے ماسٹر ممتاز علی صاحب کو دیئے جانے اور گمشدگی کا تذکرہ ہے۔

نوابی صاحب کی یہ مخلصانہ جستجو اور بے لوث تلاش بڑی قابلِ قدر ہے۔ یہ انہی کی سعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ قبلہ غازی صاحبؒ کا منظوم کلام منظر عام پر آیا۔ راقم نے بھی مقدور بھر کوشش کی کہ اس میں قابلِ قدر اضافہ ہو۔ اس میدان میں کوئی خاص کامیابی تو حاصل نہ ہو سکی مگر ذوقِ تحقیق میں ایک سند مل گئی اور بعض اجزاء بھی ہاتھ آئے۔

چاچڑ شریف (سرگودھا) کے موجودہ سجادہ نشین جناب صاحبزادہ محمد یعقوب صاحب سے رابطہ کیا گیا کہ شاید شہید موصوفؒ کا کوئی خط یا دیگر معلومات مل جائیں۔ ان کی طرف سے آپ کے صاحبزادہ جناب ریاض الدین مخدوم نے اظہارِ دلچسپی فرمایا۔ جب میرے الفاظ میں شدتِ جذبات کی وجہ سے تلخی آگئی تو جناب صاحبزادہ صاحب نے مکتوبِ ثانی میں اپنی کاوشوں سے مطلع فرماتے ہوئے ۸ر مئی ۱۹۸۶ء کو تحریر فرمایا:

"عرس مبارک کے موقع پر چاچڑ شریف مولوی ممتاز صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے عرض کی تھی کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ عنایت فرمائیں۔ پھر واپس کر دیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی مسودہ نہیں ہے۔ البتہ اگر کمال صاحب تشریف لائیں تو مجھے جو زبانی یاد ہے بتادوں گا۔ اگر کوئی دستاویز ہوتی تو ضرور دے دیتا۔ جلد ہی "حیات عزیز" کو بھیج دوں گا"۔

معلوم ہوتا ہے ماسٹر صاحب اعترافِ حقیقت سے گھبراتے ہیں۔ وہ اس قدر اخلاقی جرأت نہیں رکھتے کہ اس عظیم سرمایہ کے ضائع ہو جانے کی ذمہ داری قبول کر لیں۔ اگر وہ اس بارے میں کسی نہ کسی طرح ملوث نہ ہوتے تو حضرت شہید کے اہل و ردو لواحقین خواہ مخواہ ایسا الزام کیوں ان کے سر تھوپ دیتے۔ بہر حال یہ طے شدہ اور مصدقہ حقیقت ہے کہ ماسٹر صاحب کا اس ادبی و ملی نقصان میں دانستہ طور پر کوئی قصور نہیں تاہم اسے نادانستہ خطا یعنی لاپرواہی یا قوم و وطن کی بدقسمتی کا نام دے لیں۔ مزید برآں قبلہ غازی صاحبؒ کی نگارشات کی گمشدگی میں آپ کے رشتے داروں کی ناقدری اور سادگی بھی کارفرما نظر آتی ہے۔

یہ شہرِ سنگ ہے گھبرا گئے ہو کیوں منصور
تمہاری سمت ابھی تو یہ پہلا پتھر تھا

چودھری خیر مہدی صاحب کے بقول غازی صاحبؒ نے سفرِ نصیب کے آغاز سے لے کر جامِ شہادت نوش فرمانے تک ایک سو کے قریب خطوط تحریر فرمائے تھے۔ ابتدائی مکتوبات گویا آپ کی سیاحت کا روزنامچہ تھے۔ کسی میں لکھا ہوتا آج فلاں مقام پر ٹھہرا ہوں اور خیریت ہے۔ کبھی رقم کرتے اب یہاں آپہنچا ہوں اور کوئی تکلیف نہیں۔ یہ نگارشات انہی دنوں چھن گئیں۔ چونکہ آپ نے عملی طور پر جہاد کیا تھا اور نہ ہمیں اس ارادے سے آگاہی تھی۔ لہٰذا ان پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ تاہم حصار جیل میں قید کے دوران جب پہلی دفعہ آپ کو سزائے موت سنائی گئی تو آپ نے تسلی کی غرض سے میرے نام ایک طویل خط لکھا۔ حرف بحرف از بر تو نہیں مگر مضمون کا مزاجِ تحریر اور ملخص کچھ یوں ہے :

☆ دعا، کچھ کہئے نا کیا حال ہے؟ میں کس قدر خوش ہوں، الفاظ کی قبا نہیں پہنا سکتا اور لکھ بھی چکا تو آپ سمجھ نہ سکیں گے۔ میرے خالق نے لطف و کرم کی بارش کر رکھی ہے۔ بادلِ رحمت ہر وقت مائل بہ کرم ہے۔ یہ نہ پوچھیے کہ خدائے لم یزل نے کیا کیا احسان فرمائے؟ البتہ پوچھنے کی بات یہ ہے، مجھ پر کیا کیا آسائش نہیں اُتری؟ بھلا مالکِ حقیقی کی عنایات کا شمار ممکن ہے؟ رہنے کو مکان مل گیا جس میں تمام جہان کی رعنائیاں اور وسعتیں سمٹ آئیں۔ اور اپنا وجود پوری کائنات میں پھیلتا دکھائی دے رہا ہے۔ کس قدر محدود تھا اور کس قدر لا محدود ہوں۔ ایسی تنہائی کہ ہر لحظہ محبوب کی قربت کا گمان گزرتا ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ہرگز لب پر نہیں آسکتا۔ ہوا کے ہر جھونکے میں خوشبوئیں رچی ہیں۔ اسے مشک نافہ کا فسانہ مت جانیئے! یہ تو میرے آقا و مولا علیہ السلام کے گیسوؤں کی مہک ہے۔۔۔ کبھی کبھی تو اس مقام پر پہنچ جاتا ہوں، جہاں نالۂ جرس تو کیا سانسوں کا شور بھی بُرا لگتا ہے۔ ایک ثانیے کارواں میں تنہائی، دوسرے لمحے خلوت میں قافلے کا منظر"۔

آپ کے ایک اور خط میں اس قسم کا مضمون تھا:

☆ لوگ مجھے موت سے ڈرانے آتے ہیں۔ اُن کی عقل کو پیٹوں یا اندازِ فکر پر روؤں۔ موت تو ایک اچھا رفیق ہے۔ انسان اسے زندگی بھر بھلائے رکھتا ہے اور یہ ایک گھڑی بھی فراموش نہیں کر پاتی۔ اسے وفا کہتے ہیں۔ جو بھول جائے وہ دوست ہے اور نہ یاد کرنے والا قابلِ دوستی۔ یاد وہ کرتے ہیں جو بھول جائیں اور جو کبھی بھولے ہی نہ ہوں وہ یاد کیونکر کریں۔۔۔ غالبؔ نے "ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست" والی بات یوں ہی نہ کہہ دی تھی۔

معراجِ محبت تو یہ ہے کہ اگر کوئی طالب کو دیکھے تو اسے مطلوب کی زیارت ہو جائے۔ اور محبوب کے طلبگار چشمِ حیرت سے محبؐ کو دیکھا کریں نہ جلوۂ محبوب، بند آنکھوں سے دیکھنا چاہئے۔ ایسا تصور کہ تصویر کی حاجت نہ رہے۔ زندگی ایک حجاب ہے یہ پردہ صرف دستِ مرگ اٹھا سکتا ہے۔ زندگی، موت سے بہتر اور موت، زندگی سے حسین ہونی چاہئے۔ میں زندگی کو اپنے رسول علیہ السلام کی خاکِ قدم پر نچھاور کر کے اس وادی میں پہنچنا چاہتا ہوں جہاں میرے سجدوں کو ٹھکانا مل جائے۔

ابتدائی خطوط میں سے ایک کا اندازِ تحریر یوں تھا۔ یہ چودھری صاحب موصوف کے خط کے جواب میں لکھا گیا۔ جس میں والدہ کی بیماری اور مکان گرنے کی اطلاع دے کر آپ کو واپس آنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس وقت تک غازی صاحبؒ نے مردود کو واصل جہنم نہ کیا تھا۔

☆ایسا مکان جو ایک بار والد بنائے، پھر بیٹے کو مشقت اٹھانی پڑے۔ وہ مکان اچھا ہے نہ مکین اچھا ہے۔ مکان ہمارے لئے ہیں، ہم مکانوں کے لئے نہیں۔ معلوم ہوا مکانات گر گئے۔ چلو، گرے رہیں۔ میں وہ بنیادیں اٹھا رہا ہوں جن پر ایک ایسی عمارت کھڑی کی جائے گی، جو تا قیامت نوجوانانِ ملت کے ایمان گرمائے رکھے اور زندگی کا راز بخشے۔ والدہ حضور کے بیمار ہونے کی اطلاع میرے لئے ایک امتحان ہے مگر میں اس ذات کی عزت کے تحفظ کی نیت لے کر گھر سے چلا ہوں جس نے ہمیں ماں کا احترام سکھایا۔ مجھے اطمینان اس بات سے ہے کہ میری ماں ممتا کے ہاتھوں مجبور، یہ کوتاہی معاف فرما دیں گی۔ کیا قبلہ والدہ صاحبہ اس کو برداشت کر سکتی ہیں کہ میں اپنا مقدس مشن ادھورا چھوڑ کر چلا

آؤں ؟

محمد منیر نوائی صاحب کی رپورٹ سے یہ انکشاف ہو چکا ہے کہ غازی مرید حسین شہید اردو کلام میں اپنا تخلص اسیر کرتے تھے۔ جب کہ پنجابی اشعار میں ایم۔ ایچ لکھتے۔ آپ کی نثر نگاری کا مختصر تجزیہ تو ہو چکا۔ اب اُن کے منظوم کلام کی طرف ناقدانہ نظر دوڑاتے ہیں، جس میں سوز و ساز اور جوش و جلال کا رنگ جا بجا ملتا ہے۔ اُن کے شعروں میں مرزا غالب کی شوخی و جدت، میر کا حزن و ملال، خواجہ میر درد کا تصوف و درد مندی اور اقبال کے جذب و فقر کا تاثر موجود ہے۔ صوفی اسے عارفانہ شاعری کا گنجِ معانی اور سرمایہ لاثانی کہے گا۔ سالک کے حصے میں ہر لحظہ نیا ولولہ اور وجد آفرین سُرور آئے گا۔ مجذوب کے لئے آرزوئے دید، ہجر و فراق، عشق و مستی اور معرفت و معانی کے دریا موجزن ہیں۔ ایک ایک حرف میں تمام شاعرانہ شوخیاں، بلند پروازیاں، جدتیں، ادیبانہ لطافتیں، حسن اور رعنائیاں موجود ہیں۔ شعری ذوق کی تسکین کے لئے آپ مولوی ممتاز صاحب کے حلقہ شاگردی میں آئے اور "بیاضِ آزاد" پڑھنے کا سلسلہ بھی ایک دفعہ شروع کیا۔

الغرض اُن کا اندازِ بیان، نپا تلا، الفاظ کی بندش موزوں اور ترنم دلنواز ہے۔ آپ کے کلام میں پیغام ہے اور غنائیت بھی۔ سفر کا ذوق اور منزل پر پہنچنے کی تڑپ بھی ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے قلم سے ٹپکنے والا ہر لفظ نوائے دل کی تفسیر ہوتا تھا۔ چند سخن پارے ملاحظہ کیجیے!

خدا کا شکر ہے پیارے، جدائی مل گئی ہم کو
سوا اس کے نہیں تھا کچھ مزہ عشق و محبت کا

عشق کے پابند کو زنجیر کی حاجت نہیں
جب تصور کھچ گیا، تصویر کی حاجت نہیں

دمِ واپسیں تلک انتظار باقی ہے
فقط اک خواہشِ دیدار باقی ہے

سمندر سب سیاہی ہو، قلم دلدار کی اُلفت
زمیں تختۂ کاغذ ہو، رہیں ارمان پھر باقی

دنیا سے دل لگا کے تجھے کیا ملا اسیرؔ؟
اب عشقِ مصطفیٰ میں بھی جاں دے کے دیکھ لے

☆☆☆

کارنامہ
غازی
علم الدین شہید
رحمۃ اللہ علیہ
ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان نچھاور کرنے
والے ایک غیرت مند نوجوان کا ایمان افروز تذکرہ حیات
اس مقدس لہو کی کہانی جو مسلمانانِ ہند کو باوقار بنا گیا
گم گشتہ حقائق کی نقاب کشائی۔ (زیرِ غور)
چونکا دینے
والے دلآویز واقعات
ازقلم رائے محمد کمال
سوز و گداز میں ڈوبا ہوا قلم
شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پبلی کیشنز
مکان نمبر ۱۵۔ گلی نمبر ۵۱۔ محبوب روڈ چاہ میراں۔ لاہور

زیر اشاعت

ہزارہ کا ایک جانباز مجاہد جس نے حرمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی زندگی نچھاور کردی اسے مدینہ منورہ کی فضاؤں سے عشق تھا تحریک شاتم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نفسیاتی محرکات۔ دو قومی نظریے سے متعلق خفیہ دستاویزات ایک فرقہ کی کم نظری و خشک مزاجی، جس سے ملت اسلامیہ کا زوال مقدر بنتا جارہا تھا۔ وفا کی کہانی، صلہ شہادت اور داستان محبت کی جزئیات و تفصیلات کا بر ملا بیان، بقول شاعر

موت سے جس کی ابتدا ہو میر
اس محبت کی انتہا کیا ہے؟

شہید سیریل نمبر 3

مصنف: رائے محمد کمال

پیشکش: شہیدان ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پبلیکیشنز چاہ میراں لاہور۔